Cert

حامداً و مصلیاً

خبر و نظر

مصنفہ

سید علی حیدر

ایم۔ اے (ٹرپل)، بی۔ ایل (پیٹ)، فاضل (شمسی)، ادیب کامل (جامعہ)

لکچرر

ایل۔ ایس۔ کالج مظفرپور (بہار)

تعداد اشاعت۔ ایک ہزار ـــــ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے (عہ)

ناشر:۔ کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴

فقیہہ بھی ہیں، امام بھی ہیں، حکیم بھی، فیلسوف بھی ہیں
یہ سب کے سب باخبر ہیں لیکن کوئی بھی صاحب نظر نہیں ہے

اکبر

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیاً

خبر و نظر

فہرس مضامین .. .. .. صفحات

مصنّف کی تصنیفات

(الف) طبع شدہ :—

(۱) قواعد اردو

(۲) خیر و نظر (اسلامی مقالات کا مجموعہ)

(ب) زیر طبع :—

۱۔ نقدِ ادب (تنقیدی مقالات کا مجموعہ)

۲۔ جام و سنداں (کلام کا مجموعہ)

۳۔ پوائینرس آف اُردو (POINEERS OF URDU)
(انگریزی میں چند مقالات کا مجموعہ)

انتساب

مضامین کا یہ مجموعہ بطور تحفۂ مختصر حضرت شاہ سیّد محمد حبیب صاحب قبلہ ادام اللہ فیوضہٗ صدر مدرس مدرسہ وارث العلوم چھپرہ (سارن) کی خدمت اقدس میں بصد تکریم پیش کش ہے۔ آپ کے فیضِ صحبت ہی کا اثر ہے جو ان مضامین کا اصلی محرک ہوا۔

ع عزت بڑھے جو نذرِ عقیدت قبول ہو۔

حرفِ اوّل

میں اپنے چند مقالات کا مجموعہ "خرد نظر" کے نام سے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں یہ مضامین میرے اُن تاثرات کا ماحصل ہیں جو مشرقی اور مغربی علوم کے مطالعہ سے پیدا ہوئے۔ مغربی علوم نے جہاں بہت سے مسائل حل کئے ہیں وہیں بہت سے سوالیہ نشانات بھی پیدا کر دئیے ہیں۔ جن کے حل کرنے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں اور پیچیدگی بڑھتی چلی گئی ہے۔ یہ محض علمائے مغرب کے غیر متوازن نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے۔ یا تو انہوں نے زندگی کو رہبانیت سے قریب لاکر بے عمل بنا دیا ہے یا اسے سراسر مادیت کا رہینِ منت بنا کر حیوانیت سے قریب کر دیا ہے۔ اول الذکر نے مادی تقاضوں سے فرار کو زندگی قرار دیا ہے اور موخر الذکر نے مادی تقاضوں ہی کو عین اساسِ زندگی قرار دیا ہے۔ زندگی کی دونوں تعبیریں ناقص ہیں اور دونوں کا مدار بنیانِ مرصوص پر نہیں بلکہ تارِ عنکبوت پر ہے۔

زندگی جسم و روح کا حسین ترین آمیزہ ہے۔ جسم اور روح کے فطری تقاضوں کو فطری حدود کے اندر رہ کر پورا کر کے ہی انسان ارتقائی منازل طے کر سکتا ہے۔ ان میں سے ایک کو بھی نظر انداز کرنے کا نتیجہ نہایت ہی مہلک ثابت ہوگا۔ تاریخ کے

اوراق شاہد ہیں کہ انسان نے جب روحانی تقاضوں پر حد سے زیادہ زور دیا تو اعتدال کا پاس نہ رہ سکا۔ راہب، راہبہ اور رشی وغیرہ بن کر اس نے زندگی سے گریز کیا۔ حقائق زندگی سے یہ فراریت انسانی ارتقا کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوئی۔ اسی طرح جب کبھی انسان نے روحانی تقاضوں کو یک قلم نظرانداز کر دیا۔ اور صرف مادی تقاضوں کو مقصود بالذات قرار دے دیا۔ تو یہاں بھی اعتدال کا پاس نہ رہ سکا۔ انسان حیوان بن کر رہ گیا۔ اس غیر متوازن نقطۂ نظر نے مدتِ مدید تک افراتفری میں مبتلا رکھا اور زندگی کا ایک صحت مند اور صالح تصور عنقا رہا۔

ان دو انتہا پسند نقطہ ہائے نظر کے درمیان اسلام نے اپنا ایک صحت مند اور صالح نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اس نے جسم و روح کے فطری تقاضوں کے حدود مقرر کر دئیے اور ان کو اعتدال کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے زندگی کا ایک ایسا صالح تصوّر پیش کیا ہے۔ جو انسانیت کی معراج ہے اور سراپا رحمت ہے۔ میں نے اس نقطۂ نظر کے تحت مسائل کا مطالعہ کیا ہے اور اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان فطری حدود کے اندر رہ کر کس طرح ارتقائی منازل طے کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی بوجوہِ احسن پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ انسانیت اپنی تمام صفات و کمالات کی اکملیت کے ساتھ خیر البشر رسولؐ کی

شکل میں متشکل ہے اور انسان اپنے تمام پیچیدہ مسائل اور عقدۂ لاینحل کے کامیاب ترین حل کے لئے اس سرچشمۂ فیض اور منبع رشد وہدایت سے روشنی حاصل کرے تاکہ اس ظلمت کدہ کی پُرپیچ راہوں سے بخیر و خوبی گذرتے ہوئے دنیا و آخرت کے سفر کو بوجہِ احسن طے کر سکے۔ اور دنیوی فوز و فلاح اور اُخروی سعادت و نجات حاصل کر سکے۔

اقوام عالم میں عید کی تقریب معروف ہے۔ اور ہر قوم اپنے طور پر عید مناتی ہے۔ جشنِ نوروز ہو، ہولی ہو، یا عید الفطر ہو۔ ان سب میں وجہ تشابہ اشتراک فی المسرت ہے۔ لیکن ان تقریبات میں نقطۂ نظر کے اختلاف سے بین فرق پایا جاتا ہے۔ اسلامی عید میں انتہائی مسرت کے باوجود انسانی حدود کو برقرار رکھا جاتا ہے اور وہ کبھی وصول الی المقصود سے غافل نہیں ہوتا ہے۔ اس کی انتہائی مسرت جذبۂ عبدیت میں مستور ہے۔ اس لئے وہ سربسجود ہو جاتا ہے اور انتہائی تذلل کے ساتھ اپنے مالک الملک اور رب حقیقی سے دست بدعا ہوتا ہے۔ کسب خیر کی استعانت چاہتا ہے۔ اور شر سے پناہ مانگتا ہے۔ برخلاف اس کے غیر اسلامی عید میں جو افراتفری اور غیر فطری حرکات سرزد ہوتی ہیں وہ کسی سے ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ خیر و شر، حسن و قبح اور حق و باطل کے امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنی دنائت کے تمام مظاہرے

کر ڈالتا ہے ۔ یہ اس کو اسلامی عید سے ممیز کرنے پر دال ہیں ۔ اسلامی اور غیر اسلامی عید کے درمیان یہ خط امتیاز نہایت واضح ہے ۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو ایک ماہ کی سخت آزمائش میں کامیاب ہونے کے بعد خوشی و مسرت کا حکم دیتا ہے ۔ اس کا صالح بندہ خوشی و مسرت کے جذبہ سے سرشار ہو کر جھوم اٹھتا ہے ۔ اور اپنے خالق کل اور رب حقیقی کے سامنے فرط مسرت سے سجدہ ریز ہو جاتا ہے ۔ حصول رضائے الٰہی میں وہ اپنے لئے سب سے زیادہ مسرت اور سعادت پاتا ہے ۔ اس خوشی کی نوعیت قطعی انفرادی ہے ۔ اقوامِ عالم کی عید میں اس عید کی ایک امتیازی اور نرالی شان ہے ۔

رزم خیر و شر میں طاغوتیت اور الوہیت کی اس باہمی آویزش پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ جو روز ازل سے موجود ہے ۔ اس میں یہ حقیقت واضح کرنے کی سعی بلیغ کی گئی ہے کہ باطل کی فتح محض عارضی ہوتی ہے اور حق کی دائمی ۔ اسی کی روشنی میں کربلائے معلیٰ کے حادثات کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ جہاں شر اپنے منتہا کو پہنچتا ہے اور انسانیت کی تاریخ میں حق و باطل کی ایک فیصلہ کن جنگ ہوتی ہے جس سے انسانیت کی قدریں شکست و ریخت سے بچ جاتی ہیں ۔

ازیں قبیل روزہ کا تصور بھی اقوام عالم کے لئے کوئی نیا

نہیں ہے۔ آج بھی تمام اقوام میں اس کا رواج ہے۔ اور اس کو جسمانی صحت اور روحانی طہارت کے لئے ازبس ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی افراط و تفریط نمایاں ہے اور نقطۂ نظر کے اختلاف نے اسلامی روزہ میں ایک امتیازی اور انوکھی شان پیدا کر دی ہے۔ غیر اسلامی روزوں میں کہیں غیر متوازن طور پر روح کی طہارت کے لئے تواتر سے روزے رکھے جاتے ہیں اور کہیں جسمانی صحت کے لئے روزہ کا التزام ہوتا ہے۔ مگر یہ تمام روزے فاقہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ برخلاف اس کے اسلامی روزہ میں جسمانی اور روحانی دونوں شعبہ ہائے حیات کی اصلاح اور صحت کے لئے حتمی علاج موجود ہے۔ ایک ماہ کے مجاہدہ کے بعد انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ جسمانی اور روحانی اعتبار سے صحت مند رہ سکے۔ روحانی آلائشیں دور ہو جاتی ہیں۔ اور آئینۂ دل میں جلا پیدا ہو جاتی ہے روح توانا ہو جاتی ہے۔ ضمناً جسمانی کل پرزے بھی درست ہو جاتے ہیں۔ ایثار و ہمدردی، صبر و ضبط، خدا ترسی اور کسر نفسی کی وہ خوبیاں از خود پیدا ہو جاتی ہیں جن سے انسان کی زندگی میں احسان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک ماہ کے مجاہدۂ نفس و روح کے بعد وہ پہلے سے زیادہ بہتر انسان ہو جاتا ہے۔ اور اپنے مالک حقیقی سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ خصائص جو اسلامی روزہ کو غیر اسلامی روزہ سے ممیز کرتے ہیں۔

موجودہ دور کا سب سے مہلک ترین تصوّر مغربی جمہوریت کا تصور ہے جس کی وجہ سے حیوانی قدریں غالب آگئی ہیں۔ اس میں تمام فیصلے صحت کے اعتبار سے نہیں بلکہ عددی کثرت کے اعتبار سے کیئے جاتے ہیں۔ اس میں انسانیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اصابت و صیانت کوئی شے نہیں ہے۔ بلکہ حیوانی عددی کثرت ہی کا غلبہ ہے۔ اس تصوّر کے اعتبار سے ایک شے اس لیئے ناقابل قبول تصوّر کر لی جاتی ہے کہ جائز یا ناجائز طریقہ سے ایک سے زائد آدمی نے اس کی حمایت کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اب ردّ و قبول کا معیار صرف عددی کثرت پر ہے۔ برخلاف اس کے اسلامی جمہوریت اس سے قطعی جداگانہ ہے۔ اس میں جمہوریت کی رائے کا احترام معقولیت کی حد تک ضروری ہے۔ اگر ایک آدمی کی رائے معقولیت اور اصابت پر مبنی ہو تو اس کو ہزاروں آدمیوں کی عددی کثرت کے مقابلہ میں ترجیح دی جائے گی۔ اس سے بہت سے معاشرتی مفاسد کا سدِّ باب ہو جاتا ہے۔ اور حق و باطل کا امتیاز باقی رہتا ہے۔ حق پر باطل کا غلبہ نہیں ہوتا ہے۔ اسلامی جمہوریت میں ایک ایسے معاشرہ کا تصوّر ابھرتا ہے جس کی بنیان المرصوص حق ہے۔ اور جس میں فطری صلاحیتیں آزادی سے روبکار آتی ہیں۔ ایک صالح معاشرہ میں ایک صالح بندہ پیدا ہوتا ہے۔ یہاں انسان انسان کا غلام نہیں ہوتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ خدا کا ہوتا ہے۔ تمام بندے بلا امتیازِ رنگ و نسل

مساوی ہوتے ہیں۔

اسلام کے فلسفۂ اجتماعیت میں اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام نے فرد و جماعت کے حدود متعین کر دئیے ہیں۔ دونوں کو بے لگام نہیں چھوڑا ہے۔ یہاں فرد کو آزادی ہے مگر اتنی نہیں کہ وہ تمام حدود کو توڑ کر آمر وقت بن جائے۔ یا جماعت کو یہ اختیارات نہیں دئیے گئے ہیں۔ کہ وہ فرد کے جائز اور فطری حقوق کے اندر مداخلت کر کے اس کو پامال کر دے ۔اور خود خدا بن جائے۔ یہاں اس اجتماعیت کو قطعی شہ نہیں دیا گیا ہے جو فرد کے تمام اختیارات کو سلب کر لے اور انسان کو محض ایک مشین کا پرزہ بنا دے میں نے حتی المقدور اسی فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقالہ میں اس حقیقت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ ایک صالح معاشرہ کا وجود اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان افراتفری سے بچ کر بین بین کی راہ اختیار نہ کرے۔ جو عین فطرت ہی اس لیے کہ یہی راستہ دینوی صلاح و فلاح اور اُخروی نجات کا ضامن ہے۔

بہرصورت میں نے دورِ حاضرہ کے تراشیدہ چند بتوں کی بت شکنی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اُن مفاسد کی نشان دہی کرنے کی سعی کی ہے۔ جن کا زہر ہمارے معاشرہ کی رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ تاکہ موجودہ ذہن جو مغربی علوم کے فاسد اور مہلک اثرات

سے مسموم ہوگیا ہے۔ کچھ دیر کے لئے توقف کر کے اس نقطۂ نظر سے بھی مسائل حاضرہ کا جائزہ لے اور سعادت دارین حاصل کرے۔

وما علینا الا البلاغ ط

اگر یہ مقالے قارئین کرام کو مسائل حاضرہ کے افہام و تفہیم میں کچھ بھی ممد و معاون ثابت ہوئے تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے غور و فکر کرنے والوں اور راہ مستقیم پر گامزن ہونے والوں کو دینوی فوز و فلاح اور اُخروی سعادت سے بہرہ ور کرے۔ آمین ثم آمین ط

اخیر میں اپنے قارئین کرام سے یہ گزارش کروں گا کہ بہر حال ہماری یہ کاوش ایک انسانی کاوش ہے اور انسان کو خطا و نسیان سے کسی حال میں مفر نہیں۔ اس لئے جو کچھ انہیں پسند آئے اور صحیح و کارآمد معلوم ہو تو اس ناچیز کے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔ اور جہاں جہاں کوتاہیاں یا لغزشیں نظر آئیں۔ ان کو میری بشریت پر محمول فرمائیں اور مجھے ان غلطیوں سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اصلاح ہو جائے۔

موضع کوہلوا درگاہ، ڈاکخانہ میردا
ضلع سارن
مورخہ ۹ر جولائی ۱۹۵۸ء
مطابق ۲۱ر ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ

بندۂ کہتر
سید علی حیدر

تعارف

از مولانا حضرت سعید احمد اکبرآبادی صاحب مدظلہ العالی۔ پرنسپل مدرسۂ عالیہ کلکتہ

"خیر ونظر" جناب سید علی حیدر صاحب نیر ایم۔ اے پروفیسر ال۔ اس۔ کالج مظفرپور کے چند مضامین کا مجموعہ ہے جو اگرچہ مختصر ہیں لیکن پڑھنے میں دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ یہ سب مضامین مذہبی نوعیت کے ہیں۔ لیکن لائق مصنف کی شگفتہ نگاری نے ان میں کہیں خشکی پیدا نہیں ہونے دی۔ آخر کے دو مضمون "اسلام میں جمہوریت کا تصور" اور "اسلام کا فلسفۂ اجتماعیت" اس مجموعہ میں گل سر سبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عام قارئین کے علاوہ سیاسیات اور اجتماعیات کے طلبا کے لئے بھی ان میں بہت سی کام کی باتیں اور مفید اشارے آئیں گے۔ ان اشارات پر اگر کوئی مفصل گفتگو کرنی چاہے تو ان میں سے ہر موضوع پر ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ یہ مضامین دلچسپی کے ساتھ پڑھے جائیں گے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر صاحب کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے حسن قلم سے کام لیکر اسلامی مسائل پر اور زیادہ بسط و تفصیل کے ساتھ کلام کریں۔

سعید احمد اکبرآبادی۔ کلکتہ

۸-۳-۶۵۸

مقدمہ

از پروفیسر الحاج حضرت عبدالمنان بیدلؔ عظیم آبادی صاحب مدظلہ العالی
سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی، پٹنہ یونیورسٹی

"خرد و نظر" چند مفید مقالوں کے مختصر سے مجموعہ کا نام ہے جسے سید علی حیدر صاحب پروفیسر ال۔اس کالج مظفرپور کتابی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ سب مقالے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ محاسنِ اسلام پر پچاسوں چھوٹی بڑی کتابیں اردو میں لکھی جا چکی ہیں۔ اسی سلسلہ کی یہ بھی ایک کڑی ہے۔ آج کل جو بے دینی اور بد دینی پھیلی ہوئی ہے۔ جس ناسازگار ماحول میں ہمارے نوجوان طلبا کو رہنا ہوتا ہے اور رکھا جاتا ہے۔ اس کے پیش نظر اس طرح کی کتابیں بہت ضروری ہیں۔ یہ مجموعۂ مقالات بہ حیثیت مجموعی کالج اور اسکول کے طلبا کے لئے جو اسلامیات سے قطعاً ناواقف ہیں اور ناواقف رکھے جاتے ہیں۔ بہت کارآمد ہے۔

مذہب اور مذہب اسلام کے محاسن پر اب لکھتے ہی کتنے ہیں؟ اس دورِ لادینی میں قابلِ مبارکباد ہیں پروفیسر سید علی حیدر صاحب کہ دین و مذہب کے متعلق چند مقالے لکھ ڈالے اور لکھ کر نوجوانوں تک پہنچا بھی دیا۔ اس کتاب کا ہر مقالہ اچھا ہی نہیں خاصا اچھا ہے۔ یہ کتاب اس دورِ "روشن خیالی" میں "شمع تہذیب جدید" پر اندھا دھند

کرنے والوں کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ان مقالوں میں مسلمانوں خصوصًا فرنگی تہذیب پر مٹنے والوں کے شعور دینی کو بیدار کرنے کی پوری اور سچی کوشش کی گئی ہے۔ حیدر صاحب ان مقالوں کی مدد سے طلباء میں ان کی خاص ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں ان میں زندگی کے فرائض کو سمجھنے کی صلاحیت کو اُبھارنا چاہتے ہیں۔ طرح طرح سے ان کو سچی اور سیدھی راہ بتاتے ہیں۔ اور تہذیب نو کی فریب کاریوں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

غلام کو اپنے مالک و مولیٰ سے نزدیک کرنے والی، بندہ کو حصولِ رضائے رب العزت کی رغبت دلانے والی، اسلامیات سے روشناس کرانے والی، غلط فہمیوں کو دور کرنے والی اور حقائق کو بہ طرز احسن پیش کرنے والی اپنی طرز کی یہ ایک دل کش کتاب بھی ہے اور مفید عوام بھی۔ علی حیدر صاحب نے قرآن پاک کی اُس آیت کے مفہوم کو جابجا واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کہ اسلام کی تعلیمات کو، اسلام کے احکام کو، اسلام کے قوانین کو، اسلام کی ہدایات کو، اسلامی تاریخ کی روایات کو اور مستند احادیث کو حصول راحت و سکونِ دینوی میں بھی بڑا دخل ہے۔ اور اگر بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو اس کا مشاہدہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے، واقعات گواہ ہیں کہ حسن عمل، حسن اخلاق، حسن کردار اور حسن نیت کا ثمرہ دنیاوی عزت، سکون و راحت، ہر دل عزیزی اور سرخروئی کی صورت میں بھی ملتا رہتا ہے۔

دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ طاعت ایزدی اور طاعت نبوی کے پابند کو آلام دنیا سے آزادی حاصل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علی حیدر صاحب نے اس حقیقت کی طرف بھی اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ بدکرداری سے، عصیان کاری سے، بدنیتی سے، بداخلاقی سے، اور آخرت فراموشی سے اس دنیا کی مادی زندگی بھی طرح طرح کی آفتوں، مصیبتوں، فتنوں اور فسادوں کی صید زبون بن جاتی ہے۔ یورپ، امریکہ، روس، چین اور جاپان کے "روشن خیالوں" اور "تہذیب جدید" کی شمع اخگر بار کے پروانوں کا حال زار ذرا قریب سے دیکھ لیا جائے، اخباروں میں پڑھ لیا جائے یا صداقت شعار مبصروں سے سن لیا جائے۔

علی حیدر صاحب نے اپنی اس کتاب میں اس "نسخۂ کیمیا" کو کئی جگہ لکھا ہے کہ بہترین طریقۂ زندگی یہی ہے کہ حقوق حق اور حقوق خلق پوری طرح اور اچھی طرح ادا ہوتے رہیں۔ انقیاد و اطاعت اور تذلل و تواضع کی صفتیں پیدا کی جائیں تاکہ نعمت کونین میسر ہو۔

اس کتاب کا اسلوب نگارش اور طرز استدلال خاص ہے۔ سب سے الگ ہے اور آپ بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ سب سے منفرد ہے۔ ہر مقالہ اچھا ہی نہیں خاصا اچھا ہے۔ خرد افزا ہے، روح پرور ہے۔ مگر بعض مقالوں کے بعض حصوں میں علی حیدر صاحب اُس دنیا میں چلے گئے ہیں جو صرف عالموں اور عارفوں کی دنیا ہے۔

قانون الٰہی اور ارشاداتِ نبوی کو سمجھاتے بجھاتے رہنا،

احکامِ خداوندی اور ہدایات نبوی کی خلاف ورزی پر کلمہ گو حضرات کو ٹوکتے رہنا، اور نافرمانیوں سے روکتے رہنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ جس سے جتنا ہو سکے اور جس طرح ہو سکے۔ علی حیدر صاحب قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے یہ مجموعۂ مقالات لکھ کر اپنا فرض پورا کیا اور بہ حسن وخوبی پورا کیا۔

یہ کتاب گو چھوٹی ہے مگر ہے بہت مفید۔ ظلمتوں اور ضلالتوں میں گرفتار اور تاریکی میں بھٹکتے پھرنے والے کے لئے ہلکی ہلکی روشنی بھی بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔

خدا اس شمع بردار ہدایت کو جزائے خیر عطا کرے۔ آمین۔

دعا خواہ

عبد المنان۔ بیدل

انسانیت کا تدریجی ارتقا

زندگی وہ مسئلہ لاینحل ہے جس کے حل کرنے کی سعیٔ بلیغ روزِ ازل سے آج تک کی گئی اور کی جارہی ہے۔ اس ضمن میں حکمائے زماں نے خوب خوب موشگافیاں کیں اور اس کی پُرپیچ زلفوں کو سنوارنے کی حتی المقدور سعی کی۔

عقلائے عصر نے اس مسئلہ کے ادھیڑبن میں خونِ جگر پیا۔ روحانیت کے پرستاروں نے دنیا اور اس کے پُرفریب حُسن سے پرے جنگلوں میں، بیابانوں میں، بحر و بر میں، ہمالیہ کی دشوار گذار گھاٹیوں میں، کوہ آلپس کی سربفلک چوٹیوں پر، صحارا کے ہولناک ریگستان میں، اس کے اسرار و رموز سے آگہی حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی، اسی جوئے شیر کی تلاش میں فرہاد نے کوہ کنی کی، مجنوں نے دشت نوردی کی، نل و دمن نے جنگل و بیاباں کی خاک چھانی۔ ہیر اور رانجھا نے موت و زیست کی بازی لگادی، اسی مسئلہ کی ادھیڑبن میں حکمائے یونان نے زمین و آسمان کا قلابہ ملادیا تھا۔ بھارت ورش کے رشیوں اور منیوں نے دنیا کی

زندگی کو خیرباد کہا اور لذاتِ دنیاوی کو ترک کیا۔ اسی گوہر مقصود کی تلاش میں زرتشت نے آتشکدۂ ایران روشن کیا اور اس کے روشن شراروں میں حقیقت کی تلاش کی۔ کنفوشیش نے اپنے مخصوص نظریہ حیات کے تحت اس کی وضاحت کی ۔ صوفیائے کرام نے مجاہدات میں ادراک حقیقت کا راز جانا، مہاتما بودھ نے دنیا سے بیزاری اور ترکِ لذات میں اس سِرِّ نہانی کی جستجو کی۔ اہلِ سائنس نے ذرّات کے تجزیہ و تحلیل سے حقیقت کی مخفی طاقتوں تک رسائی حاصل کرنی چاہی۔ مادیّین نے مادّہ ہی کو مقصود بالذات گردانا اس لئے ایٹمی توانائی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ خلاصہ یہ کہ انسانی عقل و روح برابر اس عقدۂ لاینحل کی عقدہ کشائی میں سرگرداں رہی لیکن کیا اسرارِ زندگانی کا شمّہ برابر بھی ادراک ہو سکا؟ کیا اہلِ فلاسفہ کی فلسفیانہ موشگافیاں بار آور ہو سکیں؟ کیا قدرت کی مخفی طاقتوں سے کچھ بھی آگہی ہو سکی؟ کیا حکمائے عصر کی حکمت اس حقیقت کے ادراک میں ذرہ برابر بھی ممد و معاون ثابت ہو سکی؟ کیا رشیوں اور منیوں کا زندگی سے فرار انہیں وصول الی المقصود کی طرف لے جا سکا؟ کیا سائنس دانوں کی تمام کاوشیں الکٹروں اور پروٹوں کے باریک ذرّات سے آگے رہنمائی کر سکیں؟ کیا مارکس کا فلسفۂ مادیّت آئنسٹائن کا فلسفۂ اضافیّت اور فرائڈ کا فلسفہ جنسیت زندگی کے

پیچیدہ اور پُراسرار گھاٹیوں میں شمعِ ہدایت بن سکا، انسانیت کے پاس اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ پھر ضمناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اہلِ فلاسفہ کی تمام کوششیں اور صوفیائے کرام کے تمام مجاہدات بے سود ثابت ہوئے۔ میں کہوں گا، نہیں اور قطعی نہیں: یہ تمام کاوشیں اس حقیقت پر دال ہیں کہ روزِ ازل سے انسان فطری طور پر اپنے دل میں ایک پوشیدہ کسک اور خلش مستور رکھتا ہے۔ وہ اسرارِ حقیقت اور رموزِ زندگانی سے آگہی حاصل کرنے کا ایک شدید جذبہ اپنے دل میں متحرک اور موجزن پاتا ہے اور اسی جذبہ سے سرشار ہوکر دنیاوی زندگی کے پرفریب دھندلکے میں اپنی شمعِ عقل وخرد کی روشنی میں گوہرِ مقصود کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے۔ وہ ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اُٹھ اُٹھ کے سنبھلتا ہے اور سنبھل سنبھل کے گرتا ہے، اس کے پائے خرد میں قدم قدم پر لغزش ہوتی ہے۔ قوتِ انسانی بار بار جواب دیتی ہے وہ آگے بڑھنے کی ہمہ دم کوشش کرتا ہے مگر عقل کی روشنی اس کی رہنمائی سے قاصر رہتی ہے، شک وتذبذب، وہم وگمان سے قدم قدم پر دوچار ہوتا ہے، کبھی آگے بڑھتا ہے اور کبھی پیچھے لوٹ آتا ہے۔ کبھی صدیوں کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی محور کے گرد گھومتا رہتا ہے مگر حقیقت ہے کہ سراب بنی ہوئی رہتی ہے اور زندگی ایک گورکھ دھندا۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ہر زمانہ میں حکمائے دوراں نے اپنی فطری ذکاوت اور خداداد ذہانت کی مدد سے بحرِ حقیقت میں غوّاصی کرنا چاہا اور تمام خطرات اور حوادث کے باوجود گوہرِ مقصود کے حصول کی سعی کی۔ اس کے لئے فضا کی ناسازگاریوں کو لبیک کہا۔ مصائب و آلام کا خیر مقدم کیا اور جی جان کی بازی لگا دی۔ لیکن گوہرِ مقصود نہ حاصل ہونا تھا نہ ہوا۔ اور انسانی روح ہمیشہ ایک کرب و ابتلا میں غلطاں و پیچاں رہی۔ تاریخِ انسانی میں ہم جب نظر کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ عرصۂ دراز تک انسانیت تشکیک اور تذبذب کے موڑ پر مبہوت کھڑی رہی، اس کی تمام کوششیں تحصیلِ حاصل رہیں۔ اور تمام جد وجہد بے سود، مگر افسوس صد افسوس کہ انسان اپنی کج فہمی کی بنا پر گرداب کو ساحل سمجھتا رہا اور اپنی ناکامی کو کامیابی تصوّر کر کے مگن رہا۔

یہ صحیح ہے کہ انسان اپنے قوائے عقلی کی مدد سے آسمان میں پرواز کر سکتا ہے، سمندر کے سینوں کو چیر کر اس پر سے صحیح وسالم گذر سکتا ہے، مہینوں کی مسافت آنِ واحد میں طے کر سکتا ہے۔ زمین کی طنابیں کھینچ سکتا ہے، مکان وزماں پر حاوی ہو سکتا ہے، لیکن یہ تمام محیر العقول کارنامے انسان کامل کی تخلیق سے معذور ہیں۔ فضا میں اڑ کر، سمندر میں تیر کر انسان حیوانیت کی چہار دیواری سے باہر نہ جا سکا۔ کیونکہ اگر انسان کے یہ کارنامے

انسانیت کے کلاہِ افتخار میں ایک زرّیں پر کا اضافہ ہیں تو ایک کبوتر بھی انسان ہے اس لیئے کہ وہ پرواز کرسکتا ہے اور ایک مچھلی بھی انسان ہے اس لیئے کہ وہ تیر سکتی ہے۔

میں اس حقیقت کو بیّن طور سے واضح کردینا چاہتا ہوں کہ آج تک مغرب زدہ ذہنیت انسانیت کے تخیل سے ناآشنا ہے۔ اس نے انسانیت کی من مانی قدریں مقرر کرلی ہیں۔ جو اسے انسانیت سے دور تو لے جاسکتی ہیں لیکن انسان نہیں بناسکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج انسان حرص و آز، جبر و تشدد، ظلم و تعدی، خودستائی اور خودبینی، دغا و فریب اور مکر و ریا میں مبتلا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ وہ ظلم کرتا ہے لیکن عدل کے پردے میں، وہ مکر کرتا ہے لیکن خلوص کے نام پر، وہ حرص و طمع کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن صبر و قناعت کے لباس میں۔ وہ جانبداری کرتا ہے لیکن غیرجانبداری کے نام پر۔ وہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتا ہے لیکن حق و انصاف کا دامن تھام کر۔ خلاصہ یہ ہے کہ حرص و آز کا یہ بندہ اپنی شیطانی اور طاغوتی خواہشات کے پسِ پردہ وہ سب کچھ کرگذرتا ہے جس کے مٹانے کا وہ خود مدّعی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انسان گمراہ ہے، منزل سے ناآشنا ہے، حقائق سے نابلد ہے اور زلفِ گیتی کے سنوارنے سے قاصر ہے۔ اس کا تخریبی ذہن الجھاؤ تو پیدا کرسکتا ہے لیکن سلجھانے سے معذور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے دنیا کو اور دنیاوی زندگی کو جہنم زار

بنا کر جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان تمام باتوں سے ایک اور صرف ایک ہی نتیجہ مستنبط ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان صرف اپنی ناقص اور محدود عقل کی خامکاری پر اعتماد کرتا ہے اور جو کچھ اس کی عقل کی بارگاہ سے حاصل ہوتا ہے اُسے بلا تنقیح و تنقید مِن وعن قبول کر لیتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے وہ ان تمام حقائق کے ادراک سے قطعی قاصر رہتا ہے۔ جن کا تعلق حواس خمسہ کی محدود چہار دیواری سے پرے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عقل و خرد کی حد بندیوں سے باہر نہیں دیکھ سکتا۔ اور کنوئیں کے مینڈک کے مانند اپنی بظاہر خوش منظر مگر پر فریب دنیا سے خوش ہوتا ہے اور سطحِ آب پر تیر لینے اور دو چار چھلانگ لگا لینے ہی کو متاعِ حیات تصوّر کرتا ہے اور طرّہ یہ ہے کہ اس پر فخر بھی کرتا ہے اور اس طرح فطرت کی مخفی طاقتوں کا بطلان کرتا ہے جو اسے صانعِ کل نے ودیعت کی ہے اور اس بے پایاں قوتِ عمل کی تکذیب کرتا ہے جو اسے روزِ ازل میں قسّامِ ازل کی بارگاہ سے بخشی گئی تھی۔ وہ زندگی کی من مانی تاویل سے خوش ہے اور اسی پر قانع بھی، اسے وہ زندگی سمجھتا ہے اور زندگی کی حقیقت بھی۔ حالانکہ زندگی اور زندگی کے حقائق کا اس کی ان ناقص اور پر فریب تاویلات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

یہ امر مسلم ہے کہ روزِ ازل سے فطرت زندگی کی مخفی طاقتوں

کے اظہار میں ہمیشہ ممد و معاون رہی اور قدرت کاملہ انسانیت کے تدریجی مدارج طے کرنے کے ضمن میں ہمیشہ نہایت فیاضانہ طور سے قدرتی وسائل مہیا کرتی رہی۔ اسی مقصد کے تحت اس نے انسان کو عقل و خرد کی دولت سے نوازا تاکہ یہ خیر و شر میں تمیز کرسکے زندگی کی دشوار اور پُرخار جھاڑیوں سے گذرتے ہوئے گلہائے رنگا رنگ کو چُن سکے اور کانٹوں سے دامن کو بچا سکے۔ اس نے اسے احساسات اور جذبات عطا کئے جس سے وہ فطرت کے دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکن محسوس کرسکے۔ اس نے نوعِ انسانی کو حواسِ خمسہ سے نوازا تاکہ وہ ان کی مدد سے دنیاوی ماحول سے مطابقت پیدا کرسکے، اس نے اسے ایک دردمند دل عطا کیا جس سے وہ کائنات کی تسخیر کرسکے اور آفاق گیر ہوسکے۔ اس نے ایک طویل و عریض جائے سکونت عطا کی اور اس کی سقف نیلگوں کو چاند، سورج اور درخشندہ ستاروں اور سیاروں کے پرنور قمقموں سے مزین کیا اور اس کے فرش زمردیں پر پانی کی نہریں بہائیں۔ دلکش چشمے جاری کئے، سحر آفریں فوارے بنائے، جوئے سرود آفریں کے خوش کن نغمات سے سبزۂ زمرد نگار اور گلشن عالم کی رونق بڑھائی اور کوہساروں سے استواری بخشا۔ پورے عالم کو مرقعِ حُسن بنا دیا۔

قدرت کاملہ نے اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اس

عالمِ کن فکاں کی تزئین اس طرح سے کی کہ اس کی ہر شئے انسان کی چشمِ بینش کے لئے سرمۂ عبرت ثابت ہو اور انسان اس کی ہر شئے سے ترفع و بلند پروازی کا سبق حاصل کر سکے۔ پہاڑوں نے اسے عزم و استقلال کا سبق پڑھایا، بحر کے تموّج نے اپنی فطرت میں لچک پیدا کرنے کی تلقین کی، فوّاروں نے بلندی کی طرف پیہم اٹھتے رہنے اور پرواز کرنے کا درس دیا، آبِ مصفا نے صفائے باطن کی طرف اشارہ کیا قمریوں اور بلبلوں نے نغمہ سنجی سکھائی، پروانوں نے سوز دروں کی طرف نشان دہی کی تو شمع نے معرفت اور اذعان کے لئے جلنا اور پگھلنا سکھایا فضا نے اپنے اندر پہنائی اور وسعت پیدا کرنے کی ہدایت کی، آفتاب نے جود و سخا کا سبق پڑھایا، ستاروں نے رہبری کا جذبہ اُبھارا، تو چاند نے اپنی فطرت میں نرمی اور لطافت پیدا کرنے کا پیام دیا، سیماب نے تڑپنا سکھایا، آندھی اور طوفان کے پُرہول جھونکوں نے نسلِ انسانی کی بے پناہ قوت کو اُکسایا، آسمان نے گردش اور پیہم حرکت کی طرف اشارہ کیا۔ خلاصہ یہ کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کے لئے درسِ عبرت بن گیا اور اس کی بے پناہ مخفی طاقتوں کے انعکاس کا ذریعہ۔

حضرت آدمؑ نے اپنے اس نئے مسکن کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرف بخشا، روحِ ارض نے حضرت آدمؑ کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور ان تمام گوناگوں نعمتوں کی ڈالی بطورِ نذرانہ پیش کی، قدرت

نے کائنات کی تمام چیزوں کو حضرت آدمؑ کے لئے مسخّر کردیا اور ملائکہ اور اجنّہ جیسی غیر مرئی اور لطیف مخلوق پر بھی انسان کو تقدم بخشا اور اسے اشرف المخلوقات کی خلعت عطا کی، پوری کائنات میں خلیفۃ اللہ کا منصب عطا کیا، لیکن اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو انسان نے قدرت کی ان بے شمار نعمتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اس نے ان سے جائز فائدہ نہیں اٹھایا اور حد تو یہ ہے کہ اس نے خود کو بھی کما حقہٗ پہچاننے کی کوشش نہیں کی۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کی نگاہیں مادیت کی چہار دیواری سے باہر نہ جاسکیں۔ اور اس نے ہمیشہ خود کو اپنے نفس کا غلام بنائے رکھا اس نے کائنات کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی نظر کثرت کے پُرفریب مناظر سے آگے نہ بڑھ سکی۔ حد تو یہ ہے کہ یہ سراب نظر کا شکار ہو گئی، وہ راہ کی دلفریبیوں سے الجھ کر حصولِ منزل سے بے پرواہ رہا اور اس نے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا جواب عملاً نفی میں دیا اور اپنے وعدۂ روزِ ازل کو فراموش کرکے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ قدرت کاملہ نے اپنے وعدہ کی یاد دہانی کے لئے اور فطرت کی گوناگوں نعمتوں سے جائز حدود کے اندر فائدہ اٹھانے کے لئے صالح بندگانِ خدا کا ایک ایسا سلسلہ شروع کردیا جن کا کام ہی صرف یہ تھا کہ وہ بار بار اس

حقیقت کی یاد دہانی کرتا رہے کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے جواب میں بَلٰی سے جو عہد و پیماں باندھے گئے تھے وہ اس کا متقاضی ہے کہ اس کی اعتقاداً و قولاً و عملاً تصدیق کی جائے اور اس حقیقت کو واضح کرتا رہے کہ قدرت نے تمام عالم کو لفظ کُن سے پیدا کیا اور اس روز سے "کُنْ فَیَکُوْن" کا تخلیقی عمل برابر جاری ہے۔ اس طرح پے در پے قدرت درس عمل دیتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید فرقان حمید میں آمنوا کے ساتھ وعملوا الصالحات کا برابر التزام کیا گیا ہے تاکہ ذہنِ انسانی عمل کی طرف راغب ہو اور جمود و تعطّل سے گریز کرے، اس لئے کہ اس میں قوائے انسانی کے مفلوج اور مضمحل ہونے کا سامان موجود ہے، قدرت ہمیشہ کن فیکون پر خود عامل ہے اور اپنے شاہکارِ عظیم سے بھی توقع رکھتی ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی کو اس اصول پر ڈھالنے کی کوشش کرے اور فنا کی منزل سے گذر کر عملِ صالح کے ذریعہ تقربِ الٰہی حاصل کرے اور زندہ جاوید ہو جائے۔

ہم اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ ابتدائی قافلہ انسانی کے سرخیل یا نقیب اعظم حضرت آدم علیہ السلام تھے جو انسان کو بار بار قدرت کا پیغام سناتے رہے۔ اور اسے عمل صالح کی تلقین کرتے رہے۔ آپؑ کے بعد بھی یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رہا اور عہد بعہد بندگانِ صالح آتے رہے جو اس عہد محکم کی یاد دہانی کرتے رہے اور انسان کو

صمیم قلب سے اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ ان حضرات نے خود اپنی صالح زندگی کا عملی نمونہ پیش کیا، اور انسان کو بھی راہِ ضلال سے اجتناب کرنے اور راہِ مستقیم پر گامزن ہونے کی ہدایت کی۔ جس نے بھی اس راہ کو اختیار کیا وہ کامران اور شاد کام ہوا اور جو اس سے منحرف ہوا اس کی قسمت میں تیرہ بختی مقدر ہوگئی۔

قدرت کے پیغامات بار بار انسانیت کے نام آتے رہے۔ جن مقدس حضرات کو یہ فریضۂ حق سپرد ہوا ان حضرات نے پیامِ ربانی کی تبلیغ کے ضمن میں جو بھی مصائب و آلام درپیش آئے انہیں خندہ پیشانی اور ضبط و تحمل سے برداشت کیا، انہوں نے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور اس کی سعی میں، قوم کی جھڑکیاں کھائیں، اذیتیں برداشت کیں، اپنے اعضائے بدنی کو مہلک سے مہلک جراثیم کا آماجگاہ بنایا، طعن و تشنیع گوارا کیا، اپنے عزیز ترین فرزند کی قربانی دی، وطن سے ہجرت کیا، یہ سب کچھ برداشت کیا لیکن ان کی جبین پر ذرہ برابر شکن نہ آیا اور کبھی بھی لب پر حرفِ شکوہ نہ آنے دیا۔ اپنی پوری زندگی مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ کی تفسیر بنادی اور اس مقدس فریضہ کی ادائیگی میں سر دھڑ کی بازی لگادی اور کبھی بھی ناکامیوں اور ناکامرانیوں سے دل برداشتہ نہیں ہوئے بلکہ اس کو بھی مشیتِ ایزدی تصور کیا۔

اقتضائے وقت کے اعتبار سے قدرت کے پیغامات برابر آتے رہے، انسانیت بالیدہ ہوتی رہی اور اپنی طفلی کے منازل طے کرتی رہی، جب یہ سنِ بلوغ کو پہنچی تو قدرت کاملہ نے ایک ایسے قانون اور دستورالعمل کی ضرورت محسوس کی جو حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہو اور انسانیت کے تمام مادی، روحانی اور اخلاقی تقاضوں کو کماحقہ، پورا کرتا ہو گویا وہ ایک ایسے جامہ کے مانند ہو جو بالغ شدہ سرشتِ انسانی پر اس طرح چسپاں ہو جائے کہ اس میں کسی بھی ترمیم و تنسیخ کی کبھی بھی ہرگز حاجت نہ ہو۔ قدرت نے قانونِ فطرت کے اس مکمل ضابطے کو اپنے محبوب ترین پیامبر کے ذریعہ انسانیت کے پاس پہنچایا اور اس نسخہ کیمیا کو تمام روحانی، اخلاقی اور مادی امراضِ مہلکہ کے لئے شفائے کامل بتایا اور اس میں وہ صلاحیت بخشی کہ حال و مستقبل کے تمام تقاضوں کو بدرجۂ اتم پورا کر سکے اور تمام امراضِ ظاہری اور باطنی کے لئے تریاق ثابت ہو اور آخر میں یہ پیامِ مسرت آفریں نازل فرمایا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط

اس اعلان کے ساتھ قدرت نے دینِ فطرت کو مکمل کر دیا اور انسان کو ان نعمتوں سے بہرہ ور کر دیا جن کو وہ خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس مکمل نظامِ حیات کو اس نے

اسلام کے نام سے موسوم کیا۔ اوراس کے ذریعہ زندگی کی پُرپیچ زلفوں کو سنوارنے کے تمام اسرار بتائے اور کائنات کے ان تمام رازہائے سربستہ کی عقدہ کشائی کی جو ابھی تک عقلائے زمانہ اور فضلائے عصر کے سامنے عقدۂ لاینحل بنے ہوئے تھے۔ اس نے زندگی میں توازن پیدا کیا، اس طرح زمین و آسمان بدل دیا، عقل کی محفل میں عشق کو صدر نشیں بنایا، عقل و عشق کے متوازی اتصال اور ہم آہنگی نے روحانیت کے بڑے بڑے منازل طے کرلئے۔ مادی طور سے وہ فروغ بخشا کہ قیصر و کسریٰ کی باجبروت حکومتیں دیکھتے دیکھتے زیرنگیں ہوگئیں۔ شہنشاہیت کے سربفلک محلوں اور فلک پیما برجوں میں شگاف پیدا ہوگئے۔ طاغوتی نظام درہم برہم ہوگیا اور جس پر بھی اس کی ایک حقیقت افروز نظر پڑی وہ مسحور ہوگیا اور دینِ فطرت کا گرویدہ بن گیا، نظروں نظروں میں اسرارِ زندگانی کی وہ مئے پلادی کہ اسے سرمدیت وابدیّت حاصل ہوگئی، اس نے دنیا میں رہ کر دنیا سے الگ رہنے کا گر بتایا، ترک دنیا میں دنیا طلبی کے راز بتائے جیساکہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

ترک دنیا تو ہے دنیا طلبی سے آسان
چھوڑ کر سہل عبث جاتے ہیں مشکل کی طرف

اس سے یہ حقیقت واضح ہے کہ قدرت نے اپنے اس شاہکار کے فوز و فلاح کا ہمیشہ پاس رکھا۔ ہر موقع پر اس کی

دستگیری کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کفر و عصیان کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے، ظلم و عدوان کا دار دورہ ہوتا ہے، انسانیت سسکتی ہے، روحانیت خون کا آنسو بہاتی ہے، زندگی کی قدریں انسان نما حیوانوں کے ہاتھوں پامال ہو جاتی ہیں، طاغوتی طاقتیں اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ اُبھر آتی ہیں، ایسے پُرآشوب حالات اور دل فگار مناظر سے عالم بالا میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔ فطرتِ صالح مچل جاتی، قدرت بے قرار ہو جاتی ہے، زندگی کروٹیں بدلنے لگتی ہے، قدرت کاملہ تڑپ اٹھتی ہے اور اپنے اس طفلِ ناداں کو ہلاکت اور بربادی کے غارِ عمیق کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر اور راہِ ضلال کی پُرخار جھاڑیوں سے اُلجھ کر پیچ و تاب کھاتا ہوا پاکر منبعِ رشد و ہدایت اور مخزنِ فوز و فلاح سے شمعِ ہدایت کے انوار چھن چھن کر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کفر و عصیاں کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں یہ پرتوِ نور تنکے کا سہارا ثابت ہوتا ہے۔ انسان اپنی بھولی بسری راہ کو پا لیتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس ضیائے رشد و ہدایت کے سہارے آگے بڑھتا ہے اور شرک و کفر کی ہولناک موجوں کے تھپیڑوں سے بچتا ہوا وصول الی المقصود کے پُرسکون ساحل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ جہاں اُسے طمانیتِ قلب حاصل ہوتی ہے، جہاں اسے گوہر مقصود حاصل ہو جاتا ہے جہاں وہ سب کچھ پا لیتا ہے جو اپنی نادانی اور جہل کی وجہ سے کھو بیٹھا تھا، اس

راہ میں اس کا ہر قدم اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا عملی جواب ہوتا ہے اور بلیٰ کی عملی تصدیق۔ اس ہمت شکن حالت میں پرتوِ نورِ باطن اور پیکرِ رشد و ہدایت سے اس کی رہنمائی ہوتی ہے، جس کا ایک کنارہ منبعِ نورِ کل سے اور دوسرا کنارہ عالمِ انسانیت سے متصل ہے۔ یہ فضائی ایتھر سے بھی زیادہ اہم کارنامے انجام دیتا ہے اور اُلوہیت سے انسانیت تک پیغامِ ربّانی کا واحد ذریعہ بنتا ہے۔ اس کی تخلیق مرئیت اور غیر مرئیت کے اشتراک سے عمل میں آتی ہے، اسی ذریعۂ رشد و ہدایت اور پیغامِ ربّانی کو رسول یا پیغامبر کے مقدس نام سے موسوم کرتے ہیں، ان خاص بندوں کے احکام کی تعمیل عین خالقِ مطلق کے احکام کی تعمیل ہے اور ان کی تکذیب عین خالقِ کل کی تکذیب ہے۔ یہی وہ انسانی زندگی کا موڑ ہے جہاں صرف اتباع میں فوز و فلاح ہے اور انکار میں بربادی و ہلاکت۔ یہاں پیروی سے حق کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور اس کا اذعان بھی۔ اس کی آفاقی اور ہمہ گیر طاقتیں انسانیت کو کشاں کشاں اور رواں دواں صراطِ مستقیم کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہاں اتباع، پیروی اور تصدیق عین فطری صداقتوں کی پیروی اور تصدیق ہے اور اس سے گریز عین فطرتِ انسانی سے گریز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالقِ مطلق نے اپنے حبیبِ اکرمؐ کو اپنے مقدس صحیفہ میں یوں ارشاد فرمانے کی تلقین فرمائی ..... فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ ط

جیسا کہ میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ قدرتِ حقیقی اپنے شاہکار کی تمام خفی اور جلی قوتوں کے اظہار کے سلسلے میں اس کی پوری پوری معاونت کرتی ہے، راہِ ضلالت سے بچاتی ہے اور راہِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے لیکن انسان ایسا ضدی اور ہٹ دھرم واقع ہوا ہے کہ اسے کفر اور عدوان میں بے حد لذّت محسوس ہوتی ہے، وہ شرک اور توہم پرستی کی پُرفریب گھاٹیوں سے اس طرح مسحور ہو جاتا ہے کہ بار بار صراطِ مستقیم سے پھسلتا ہے اور اس پُرفریب اور خوش منظر سبز باغ کی طرف رجوع کرتا ہے جو اسے تباہی اور ہلاکت کی دعوت دیتا ہے اور اس طرح طوفانِ نوحؑ، جنگہائے عظیم اور ہیروشیما کی ایٹمی تباہیاں خود مول لیتا ہے۔

آج جب کہ انسانیت موت وزیست کی کشاکش میں مبتلا ہے۔ تخریب و تعمیر کے چوراہے پر مبہوت کھڑی ہے اسے خیر و شر میں امتیاز مشکل ہے، نفسِ لوامہ اسے راہِ مستقیم کی طرف رجوع کرتا ہے تو نفسِ امّارہ اسے راہ ضلال کی بظاہر خوشنما مگر ہلاکت خیز غار کی طرف راغب کرتا ہے وہ کبھی خیر کی طرف بڑھنا چاہتا بھی ہے تو شر کی رنگینیاں اسے اپنی طرف راغب کر لیتی ہیں اور وہ کشاں کشاں غیر شعوری طور پر ادھر کھنچ جاتا ہے۔ اب اس کے لئے دو شکلیں ہیں۔ یا تو پیامبر حق سے ناطہ جوڑ کر عالم گیر روحانی اور جسمانی ہلاکت و تباہی کے طوفان نوح سے اپنی کشتی کو بچالے یا

اپنے آپ کو ایک ہولناک طوفان کے سپرد کر دے اور فِی نَارِ جَہَنَّمَ خَالِدِیْنَ فِیْھَا کے حکم ناطق کے تحت ابدی خسران سے دوچار ہو جائے، اس کے لئے راہِ فلاح اس میں ہے کہ وہ تمام لادینی اور طاغوتی طاقتوں کی ببانگِ دہل تکذیب کرے اور حق کی تصدیق کر کے اذعان و معرفت حاصل کرے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے پیغامِ حق اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کی عملی تصدیق کرے اور حیاتِ جاوداں حاصل کرلے۔ اسی میں اس کی دینی و دنیاوی بھلائی کا راز مضمر ہے اور یہی اس کی ابدی اور سرمدی و روحانی مسرت اور جسمانی توانائی کا ضامن ہے۔ اس راہ پر چل کر انسانیت کامراں ہو سکتی ہے اور اس سے پھسل کر قعرِ مذلّت میں گر سکتی ہے۔ فطرت صالح کا تقاضا ہے کہ انسان فوز و فلاح کی راہ اختیار کرے اور راہِ خسران سے گریز کرے۔

بسمِ اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحیم

آفتابِ ہدایت

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ روزِ ازل سے قوائے خیر و شر میں آویزش رہی ہے کبھی خیر کو غلبہ حاصل ہوا تو کبھی شر کو، اور یہ سلسلۂ لامتناہی قرنوں تک جاری رہا۔ یہ بھی امرِ مسلّمہ ہے کہ شر کی فتح عارضی ثابت ہوئی اور خیر کی دائمی۔ تاریخی شواہد اس پر دال ہیں۔ لیکن شر نے کبھی بھی اپنی شکست قبول نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی میں حوادثِ فاجعہ پیش آتے رہے اور انسانیت کا قافلہ عرصۂ دراز تک تلاشِ حق میں سرگرداں رہا اور فضا کی تاریک پہنائیوں میں حقیقت کو ٹٹولتا رہا۔ اس کی مساعیٔ جمیلہ، جدّ و جہد اور کرب و اضطراب اس حقیقت پر دال ہے کہ قدرت نے اس کے دل میں تلاشِ حق کے لئے کسک ودیعت کی تھی۔ فسق و عدوان کی تیز آندھی بھی اس شمعِ حقیقت کی لَو کو فسردہ نہ کرسکی۔ انسانیت کے دل کا چراغ فروزاں رہا

اور سوز دروں پیدا کرتا رہا۔ انسان کا دل سراپا تلاش و جستجو بنا تھا اور شر کے مفاسد اس کی راہ میں سنگ گراں۔

قدرت نے انسان کو زمان و مکان کا قیدی بنایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسخر کرنے کے لئے بے پناہ قوتیں بھی ودیعت کی ہیں۔ انسان نے جب اس سے کام لیا تو ہزاروں میل کی مسافت سمٹ گئی، تمام دنیا گھر آنگن بن گئی۔ برسوں کا کام لمحوں میں انجام پانے لگا، فضا کی پہنائی اور سمندر کی اتھاہ گہرائی سطحِ ارض بن گئی، وحیِ الٰہی میں اسی قوتِ تسخیر کی طرف اشارہ ہے۔

سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ الخ

اس ضمن میں یہ بات بھی ناقابلِ انکار ہے کہ زمانے کے ساتھ انسانی زندگی کی قدریں بھی بدلتی رہیں۔ مفاد پرستی اور انانیت نے ایسا مغالطہ پیدا کیا کہ زمین کو آسمان بنا دیا، خیر و شر میں تمیز مشکل ہو گئی۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ادعائے خیر اور بطلانِ شر کے نام پر کیا گیا۔ خیر و شر کو کچھ اس طرح گڈمڈ کر دیا گیا کہ اس پر ابہام اور تشکیک کا ایک دبیز غلاف پڑ گیا۔

یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ مبادیات میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ صرف جزئیات میں تبدیلی ہوتی رہی۔ احوال و ظروف تغیر پذیر رہے لیکن حق حق رہا اور ناحق، ناحق۔ مفاد پرست

حضرات کی مصلحت اندیشی بھی حق کو ناحق نہ ثابت کر سکی - ہاں حق کا نام لے کر فساق و فجار نے خوب خوب حق کا خون بہایا - انسانیت اس جذبۂ شر کے تحت مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی رہی، کبھی شہنشاہیت کے بھیس میں اس نے اپنی پرستش کرائی اور ظل اللہ بنی، کبھی نازیت اور فاشیت کی شکل میں اپنی قہرمانی کا مظاہرہ کیا - کبھی آمریت نے اُولی الامرِ منکم سے سندِ جواز حاصل کیا، کبھی جمہوریت نے عوام کے لئے عوام کو مغالطہ دیا، کبھی اشتراکیت و اجتماعیت نے ایک نئے قسم کی آمریت کی طرح ڈال دی - خلاصہ یہ ہے کہ انسانیت کا قافلہ رواں دواں، اُفتاں و خیزاں بار بار ٹھوکریں کھاتا رہا پر جہاں سے چلا تھا وہیں کا وہیں رہا اس کے درد کا مداوا نہیں ہو سکا۔

اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی نفسانیت تھی جس کی شیطنت ہمیشہ جذبۂ الوہیت پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اس سے متصادم رہی - اس نے کبھی حق کو حق سمجھنے نہیں دیا، انسانی ذہن نے جب اس کا اذعان کرنا چاہا تو فی الفور اِس نے ظن و قیاس کا دبیز پردہ اس پر ڈال دیا - حقیقت سراب ہو کر رہ گئی - زندگی کا کارواں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا لیکن اس کی تشنگی نہ بجھنا تھی نہ بجھی - بلکہ اس منظر سراب نے اس کی تشنگی پر مزید تازیانے کا کام کیا۔

اسی کشمکش میں زندگی کا کارواں چلتا رہا - زندگی کی سادگی،

پیچیدگی میں بدلتی چلی گئی، مسائل الجھتے چلے گئے، انسانیت مرکز سے دور ہوتی چلی گئی، راہِ مستقیم راہِ ضلال میں مبدّل ہوگئی۔ انسان جس کی فطرت خیر پر مبنی تھی شر سے قریب ہوگیا۔ الوہیت سے بُعد اور شیطنت سے قُرب ہوتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ انسان کی فطرت تک مسخ ہوگئی، خیر و شر میں تمیز مشکل ہوگئی۔ ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ شر، خیر نظر آنے لگا اور اس نے اپنی کج فہمی اور کج روی کی مختلف دور از کار اور بعید الفہم تاویلیں پیش کرنی شروع کردی۔

قدرتِ کاملہ اس منظرِ جانکاہ سے متاثر ہوئی، اس کا دل بھر آیا۔ اپنے شاہکار کی ذلّت و خواری دیکھی نہ گئی، اس نے انگڑائی لی، سحابِ رحمت گھر گھر کر آیا اور اُمڈ اُمڈ کر برسا۔ انسان کے کشتِ سوختہ کے لئے حیات بخش ثابت ہوا اور یہ سلسلہ وقفہ کے ساتھ برابر جاری رہا۔ ادھر الوہیت اور طاغوتیت کی کشمکش بھی جاری رہی۔ قدرت نے صلحا کے ذریعے الوہیت کو تقویت بخشی اور شیطنت نے قوائے شر سے اس کا تدارک کرنا چاہا۔ یہ کبھی نمرود کی شکل میں نمودار ہوئی تو کبھی فرعون کی، کبھی شدّاد کا چولا بدلا تو کبھی حسن بن صباح کا، کبھی شہنشاہیت کے زرنگار لباس میں ظاہر ہوئی، تو کبھی جمہوریت کا لبادہ زیب تن کیا، کبھی آمریت، نازیت اور فاشیت کا سوانگ رچایا۔ تو کبھی اشتراکیت کا روپ دھارن کیا، خلاصہ یہ ہے کہ یہ ظواہر پُرفریب سے

انسان کے دین و ایمان پر بار بار حملہ آور ہوئی، ہر پہلو سے ضربِ کاری لگانا چاہا اور تمام مواقع سے پہلی فرصت میں اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے سلسلے میں جدوجہد شروع کردی۔ یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔ ان قوائے فاسدہ کے استیصال کے لئے قدرت نے کبھی ابراہیمؑ کو پیدا کیا تو کبھی موسیٰؑ کو، کبھی نوحؑ کو پیدا کیا تو کبھی عیسیٰؑ کو۔ چنانچہ تخلیقِ آدمؑ سے لیکر آنحضرتؐ تک ایک ایسے بندگانِ خاص کا سلسلہ ملتا ہے جنہوں نے شیطنت کے پھیلائے ہوئے فسق و عدوان اور کفر و شرک کے تند و تاریک غبار سے حقیقت کو پاک کرنے کی ہمہ دم سعی کی، وحدانیت کو نکھارا، حقیقت سے پردہ اٹھایا، کھرے اور کھوٹے کی تمیز بتائی، بندہ سے خدا کا وہ خاص رشتہ جو شیطانی وسوسہ کی وجہ سے مضمحل ہوگیا تھا از سرِ نو جوڑا۔ اس وسیع و عریض کائنات میں انسان کا مقام متعین کیا، فرائض و حقوق سے آشنا کیا۔ اسرار و رموز کو بے نقاب کیا، قلزمِ حیات سے گوہرِ شاہوار نکالے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عقل و روح کے تمام اشکال دور کئے۔ زلفِ گیتی کو سنوارا، عالمِ کون و مکان کو گلدستۂ حیات بنادیا، بے لگام عقل و خرد کی خود رو جھاڑیوں سے پاک کیا۔ اور حقیقت کے گلہائے رنگارنگ سے مزین کیا۔ موزونیت بخشا، عقل کو بلند پروازی اور روح کو ترفع عطا کیا اور بتایا کہ ؎

ترا ز کنگرہ عرش میزنند صفیر
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد ست

اور پھر فرمایا۔ ؎

در دشت جنوں من جبریلؑ زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

یہ امرِ مسلمہ ہے کہ انسان کی تخلیق میں دو اجزائے ترکیبی شامل ہیں۔ حیوانی اور انسانی۔ حیواتی زندگی کی بنیاد پروٹوپلازم پر ہے جس کی نشو و نما کے لئے قدرت نے کائنات کو پیدا کیا اور جمادات، نباتات اور حیوانات کو انسان کے لئے خلق کیا، اس کی نشو و نما اور تغذیہ کے لئے ان میں سامان بہم پہنچایا اس اعتبار سے انسان حیوان سے زیادہ مشرف ہونے کا استحقاق نہیں رکھتا تھا لیکن قدرتِ کاملہ نے تمام کائنات پر تفوق بخشنے کے لئے قوتِ تمیزی عطا کی، انسانی قدروں سے نوازا۔ خیر و شر کا علم دیا، قوتِ تسخیر عطا کی، اخلاقی قدروں سے آگہی بخشی۔

قدرت، انسانی زندگی کے کمزور پہلوؤں سے واقف تھی۔ اسے اس کا علم کامل تھا کہ انسان کہاں کہاں اور کب کب ٹھوکریں کھا سکتا ہے اور کب طاغوتی قوتیں اس پر غالب آسکتی ہیں۔ اس لئے اس نے زرہِ ترحم و خلق پروری بار بار ہدایتِ صالحہ سے انسان کو نوازا اور بندگانِ خاص کا اسوۂ حسنہ نمونتاً پیش کیا۔

جن حضرات کی سیرت صالح تھی انہوں نے شرحِ صدر کے ساتھ پیغامِ خیر کو قبول کیا اور جن کی سیرت غیر صالح تھی انہوں نے اپنے میں قبولِ حق کی صلاحیت کا فقدان پا کر پہلو تہی کی۔ رشد و ہدایت کے لیئے خالقِ مطلق نے صحائف نازل کیئے، رُسُل خاص کے ذریعے پیغامِ قدسی بھیجا، دینوی اور اُخروی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا، جیسے جیسے انسانی شعور بالغ ہوتا گیا اور عقل و روح میں پختگی آتی گئی۔ قدرت نے اسی اعتبار سے صحائف رشد و ہدایت نازل کیئے۔ زندگی تغیرات سے دوچار رہی اور مختلف منازل طے کرتی رہی۔ بالآخر عہدِ طفلی اور عہدِ شباب کی خام کاریوں سے آگے بڑھی، شعور کی پختگی، تجربات کی فراوانی اور عقل و خرد کی بالیدگی نے انسان کو اس منزل پر پہنچا دیا کہ اب اسے ایک ایسے دستور العمل اور نظامِ حیات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جو اس کے جسم پر تا حیات کار آمد ثابت ہو سکے۔ قدرت کاملہ نے وہ ضابطۂ حیات نازل کیا جو انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے اور سرمدیت و ابدیت کا ضامن ہے۔ اس نے حق اور ناحق کے درمیان قیامت تک کے لیئے خطِ متارکہ کھینچ دیا اور بحروفِ جلی واضح کیا۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ..... الخ

یہ پیغام رہتی دنیا تک کے لیئے ہے، ترمیم و تنسیخ سے بے نیاز ہے۔ یہ حیات افروز ہے، جاں بخش ہے، امن و آشتی

کا علم بردار ہے، کونین کے خسران سے نجات دہندہ اور ازلی فوز و فلاح کا ضامن ہے، یہ تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے اور محاسن سے معمور ہے، یہ مکمل ہی نہیں ہے اکمل ہے اور اسی لئے وحیِ الٰہی نے اس آیت سے اس کی تصدیق کی ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ .... الخ

یہ آواز عرب تک محدود نہ رہی۔ تمام اکنافِ عالم میں پھیلی جہاں پہنچی ذرہ کو خورشید بنا دیا، پتھر کو پارس پتھر میں تبدیل کر دیا۔ اور مٹی کو اکسیر بنا دیا۔ تمام انسان نے جن کی فطرت صالح تھی، اور جو چشمِ عبرت بیں اور گوشِ نصیحت نیوش سے بہرہ ور تھے، اس پیغامِ حق کو سنا اور نتائج سے متنبہ ہوئے، ببانگِ دہل اس کو لبیک کہا اور جن کی فطرت شرپسند تھی اور جن کے دل و دماغ میں قبولِ حق کی صلاحیت کا فقدان تھا انہوں نے پہلو تہی کی، تمسخر اڑایا اور تکذیب کی، بہت سی آویزشیں ہوئیں، طاغوتیت نے آخری بازی لگا دی، زندگی کے ہر موڑ پر تصادم ہوا۔ یہ کبھی ابوجہل کی شکل میں نمودار ہوئی تو کبھی ابی لہب کی شکل میں، کبھی قیصر کی شکل اختیار کیا تو کبھی کسریٰ کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آخری مورچہ پر قابض ہونے کے لیے اس نے اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ شمعِ حق کو گل کرنے کے لئے کفر و عصیان کی تند و تیز آندھی چلی، انسانیت موت و زیست کی منزل سے گذری۔ طاغوتیت اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ

تمام آلاتِ کفر و شرک سے لیس ہو کر نمودار ہوئی اور اس نے اپنا پورا حوصلہ نکال لینا چاہا لیکن حق نے نورِ حق کو افسردہ ہونے سے بچا لیا۔ شمعِ حق کے پروانوں نے پروانہ وار خاکستر ہو کر اس کی لو کو اور تیز کر دیا، بہ فضلِ خداوندی قیامت تک کے لئے شمعِ حق تابندہ رہی۔ خالقِ کل خود اس کی محافظت کا ضامن بنا، ظاہر ہے کہ جس کا محافظ خالقِ مطلق ہو اس کو پھونکوں سے تو کیا طوفانوں سے بھی بجھایا نہیں جا سکتا۔

جب دینِ فطرت کے آخری پیغام کے نازل ہونے کا وقت آ پہنچا تو قدرتِ کاملہ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے اتمامِ حجت کر دی اور تمام بنی نوعِ انسان کو ساکت کر دیا، یہ تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو مخاطب کیا حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو آواز دی اور حضرت عیسیٰؑ نے نصرانیوں کو پیغامِ حق سنایا لیکن رحمۃ اللعالمینؐ نے تمام عالم کو خطاب کیا۔ انسان کو انسانیت کا سبق سکھایا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کی قولاً و فعلاً تصدیق کی اور عالم سے تصدیق کرائی۔ انسان کو صلاح و فلاح کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ راہِ مستقیم سے آشنا کیا۔ راہِ ضلال سے متنبہ کیا۔ دعوت الی الخیر دی اور شر سے بچنے کی تنبیہ کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ الوہیت سے قریب کرنے کی کوشش کی اور طاغوتیت کے شر انگیز قویٰ کو ضرب کاری لگایا۔ حیاتِ ابدی کا

پیغام دیا۔ دینِ فطرت کو نکھارا، انسانی زندگی پر کثافت و غلاظت کے جو دبیز غلاف پڑے ہوئے تھے اُسے دور کیا۔ قوم، رنگ و نسل کی محدودیت سے انسان کو باہر نکالا۔ عصبیت و تنگ نظری کے مہلک و متبذل نظریات کی فلک شگاف عمارت کا مکمل استیصال کر دیا۔ کبر و نخوت، کفر و عصیاں، فسق و فجور اور ظلم و ستم کا تخیل پاش پاش ہو گیا۔ خدائی کے دعویداروں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ قیصر و کسریٰ کے باجبروت ایوانِ شکست و ریخت کی منزل میں آ گئے۔ انسان کی خدائی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ انسان انسان کا بندہ نہ رہا۔ خدا کا بندہ ہو گیا۔ عبد و معبود کا ٹوٹا ہوا رشتہ سلکِ توحید سے منسلک ہو گیا۔ بندہ اللہ سے قریب اور غیر اللہ سے دور ہو گیا۔ امن و سلام کے پیامبر نے بلا امتیاز مذہب و ملت امن و آشتی کا پیغام تمام عالم کو سنایا۔ انسانیت کی قسمت جاگ اُٹھی۔ زلفِ گیتی سنور گئی اور انسان نے کائنات میں اپنا مقام پا لیا اور بول اٹھا۔

نَحْنُ خُلِيْفَةُ اللّٰهِ ؎

اس لئے کہ خدائے پاک نے خود کلام پاک میں فرمایا تھا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؎

مصلحِ اعظم ؐ نے سب سے پہلے توحید کے تخیل کو نکھارا۔

اس لئے کہ غیر الٰہی مذاہب کا تو ذکر ہی چھوڑ دیجئے مدعیانِ دینِ حق

نے بھی وحدانیت کے تخیل کو ضرب کاری لگا دیا تھا، صیہونیت کے پرستاروں نے اپنی ذہنی پیچ، تیزیٔ طبع، کج فہمی اور طاغوتی طراری کے پیش نظر اس پاک تخیل کو مفاسد سے ملوث کر دیا تھا، نصرانیت کے علمبرداروں نے تثلیت پرستی شروع کر دی تھی۔ کفار تو منکر ہی تھے، مشرکین نے وحدانیت کے مدمقابل ہر ذرہ کو خدا بنا لیا تھا، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے مقلدین نے لات وہبل کی تخلیق کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ وحدانیت کا تخیل ان مہلک، کثیف اور مذموم تخیلات سے ملوث ہو کر کثرت کے گرد وغبار سے اٹ گیا تھا۔ اسلام کے مصلح اعظم نے اس پر ضرب کاری لگایا اور وحدانیت کے تصور کو کثرت کی کثافت سے منزہ کیا اور ببانگ دہل اعلان کیا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ...... الخ

انسانیت کی ارتقائی جدوجہد میں سب سے عظیم کارنامہ وہ ضابطۂ حیات ہے جس کو اسلام نے پیش کیا یہ انسانی مسائل کا آخری حل ہے۔ اس نے انسان کے طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی تمام مسائل کے حل کرنے کی مکمل ترین شکل پیش کی ہے اس نے مذہب کے اس تصور کے نقص کو رفع کیا ہے جس کی رُو سے مذہب محض چند معتقدات کا نام ہے اسلام کے عروج کے قبل ان معتقدات کے علاوہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں غیراللہ کے رحم وکرم کا عمل دخل تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس کی اصلاح کی اور نہ صرف یہ کہ پیغامِ الٰہی پہنچایا بلکہ عملی نمونہ بھی پیش کیا اور مختلف حیثیات سے عملی زندگی گذار کر بھرپور اور مکمل صالح زندگی کی ترجمانی کی۔ ایسی زندگی جس کی بنیاد راہِ مستقیم پر استوار ہو جو فصل کی نہیں بلکہ وصل کی متقاضی ہو۔ آپؐ نے انسان کو کائنات کی بندگی سے نجات دیا اور مردِ مومن کی اس زندگی سے آشنا کیا جو سراپا رحمت و رافت ہے، انسانیت کی بھرپور ترجمان ہے اور جو کفر و الحاد کی فساد انگیز دنیا پر ایک زبردست طنز ہے جس میں انانیت و خود پرستی کے بجائے خود شناسی و خود آگاہی معیارِ انسانیت ہے۔

ابتدائے آفرینش سے انسان اجتماعیّت کی طرف ایک فطری میلان رکھتا ہے وہ فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ تجرّد کی زندگی اس کی فطرت کے خلاف تھی اور اجتماعیّت اس کی فطرت کے عین مطابق، لیکن کبھی کبھی وہ اس حقیقت سے ناآشنا ہوگیا اور اس نے حق تلاشی کے لئے رہبانیت اور تجرّد کی زندگی اختیار کی۔ انسان صدیوں مضطرب رہا لیکن راہب اور یوگی کی زندگی وصول الی المقصود کی طرف رہنمائی کرنے سے قاصر رہی۔ بالآخر دینِ فطرت کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ تجرّد، ترہّب اور عدم تشدّد کے ڈھول کا پول کھل گیا۔ زندگی سے فراریت قرار

ہوگئی اور اجتماعی زندگی کے تقاضے مکمل طور پر عود کر آئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی نے اس غیرفطری رجحان اور منفیانہ نقطۂ نظر کا بطلان کیا۔ اجتماعیت کے فوائد سے آشنا کیا۔ زندگی میں جلال و جمال کی ہم آہنگی پر زور دیا۔ جمال کا وہ ناقابلِ عمل منفی پہلو جس کی ترجمانی رہبانیت نے کی تھی اُس کی اصلاح کی۔ اور انسان کو مجبورِ محض ہونے سے بچالیا۔ اور اس پر یہ بیّن طور سے واضح کردیا کہ وہ جلال جو جمال سے عاری ہو شیطنت ہے اور وہ جمال جو جلال سے اس قدر عاری ہو کہ جس سے انسان مجبورِ محض ہو کر رہ جائے اللہ کی نظر میں مرغوب نہیں اس لئے کہ جہادِ زندگانی میں دونوں کی ضرورت ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جلال و جمال کی حسین امتزاج ہے۔ نظامِ طاغوتی کے مقابل آپ فولاد سے بھی زیادہ سخت ہیں اور ایک غیرمتزلزل عزم وارادہ کا پیکر معلوم ہوتے ہیں اور عشقِ الٰہی کی وادی میں حریر و پرنیاں سے بھی زیادہ نرم۔ آپ نے ایک متوازن اور قابلِ عمل زندگی کا وہ کردار پیش کیا ہے جو رہتی دنیا تک کے لئے ایک مثال ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانیت پر ایک احسانِ عظیم یہ بھی ہے کہ آپ نے روحانیت کے غلط تصور کی اصلاح کی۔ اور اس کو مفاسد سے یکسر پاک کرکے روحانیت کا

صحیح تصور پیدا کیا۔ ترہیب، تجرّد اور فراریت کے مہلک جراثیم سے اسے منزّہ کیا اور اس طرح روحانیت کے رائج الوقت تخیل کو نکھار کر فقر کا صحیح مفہوم واضح کیا۔ انسان کو بتایا کہ دنیاوی آلائش کے اتھاہ سمندر میں بھی انسان ضابطۂ خداوندی کے تحت اپنی زندگی گذار کر کنول کے مانند دامن تر ہونے سے بچا سکتا ہے اور آپؐ کی عملی زندگی اس پر دال ہے جس سے یہ واضح ہے کہ دنیا میں رہ کر اور راہِ مستقیم پر گامزن ہو کر انسانیت کی صلاح و فلاح کے لئے کوشاں رہنا، جدوجہد کرنا، قوائے شر کے متقابل اپنی تمام صلاحیتوں کو روبکار لانا اصل فقر ہے۔ دنیا سے فراریت اختیار کرنا اور انسانیت کو طاغوتی نظام کے رحم وکرم پر مجبورِ محض بنا کر چھوڑ دینا، بالواسطہ قوائے شر کی معاونت ہے۔ انسانیت کے تزکیہ سے بے نیاز ہو کر اپنے تزکیہ پر مُصر ہونا صریح خود غرضی ہے جس کو قدرت کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ بازپرس لابدی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صرف آدم علیہ السّلام کو ہی نہیں پیدا کیا بلکہ آپ کی ذریات کو بھی پیدا کیا اور ان کے رشد وہدایت کے لئے صلحا و انبیا کو مختلف مقامات پر پیام قدسی کے ساتھ بھیجا جنھوں نے قولاً و فعلاً دعوت الی الخیر دی اور شر سے متنبہ کیا۔ اس لئے انسانی معاشرے کے وہ ارکین جن کی سیرت و فطرت میں خیر غالب عنصر کی حیثیت سے شامل تھا اُنھوں نے اگر انسانی معاشرہ

سے فرار اختیار کیا اور تزکیۂ ذاتی کے لیئے ذریات آدمؑ سے پہلو تہی کی، حتی الامکان اس کی اصلاح کی کوشش و کاوش نہیں کی تو انہوں نے قدرت کی اس لازوال نعمتِ غیر مترقبہ کا حق نہیں ادا کیا۔ ان کے عالمِ تجرّد کے مجاہدات و عبادات سے ممکن ہے کہ حق اللہ ادا ہوجائے لیکن حق العباد کے مطالبات کو ان کی عبادت و ریاضت سے شکوہ ہی رہ جائے گا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روحانیّت کے اس مسموم فراری تصوّر سے انسانیّت کو نجات دلایا حق اللہ اور حق العباد کے مفہوم کی وضاحت کی۔ انسانی زندگی میں توازن، اعتدال، موزونیّت اور ہم آہنگی پیدا کی۔ فرد کے حقوق و مطالبات اور جماعت کے حقوق سے روشناس کیا اور نمونہ کے طور پر اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کا عملی اسوۂ حسنہ پیش کیا۔ اسلام کے داعی نے نہایت واضح طور سے یہ بتایا کہ انسانیت کی نجات، فراریت میں نہیں بلکہ ذکر اللہ اور خدمتِ خلق میں ہے۔ ان دونوں پہلوؤں میں سے اگر ایک کو نظر انداز کیا گیا تو دوسرا پہلو تشنہ رہ جائے گا۔ انسانی معاشرے میں فساد کا خطرہ لاحق ہوگا اور اس طرح شخصیّت کی تکمیل غیر متوازن ہوگی۔ فطرت کے تقاضے پورے نہیں ہوسکیں گے۔

یہ امر واقع ہے کہ انسانی مسائل دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو زیادہ واضح، متعین اور سریع الفہم ہیں اور دوسرے

وہ جو زیادہ مبہم، غیر متعین اور بعید الفہم ہیں۔ کلام الٰہی نے پہلے کو پہلے کو محکمات اور دوسرے کو متشابہات سے تعبیر کیا ہے۔

محکمات کے سلسلے میں زیادہ خطرات سے دوچار ہونے کی نوبت کم آتی ہے اگر کبھی ان پر زد پڑی ہے تو صرف متشابہات کی غلط تاویلات کی وجہ سے اور اس ضمن میں انسان کی تیزیٔ طبع نے جب کبھی کج روی اختیار کی ہے تو بار بار ٹھوکریں کھاتی پڑی ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب ایک بار ٹھوکر لگتی ہے تو بار بار لگتی ہے، مسائل میں گرہیں لگتی چلی جاتی ہیں، ناخنِ تدبیر تھک جاتا ہے اور غلط نتائج مستنبط کر لیتا ہے۔

رسالت مآبؐ نے جہاں جہاں خطرات تھے اس کی نشان دہی کر دی اور انسانیت کو کج فہمی کے دلدل سے نجات دلائی۔ آپ نے کلامِ الٰہی کے مبادیات کے پیش نظر اسلامی افکار کو جلا بخشی۔ محکمات کے اذعان کے لئے اہلِ فکر کو دعوت دی، متشابہات کی بے جا تاویلات میں الجھنے کے مہلک اثرات سے متنبہ کیا اور ان تمام مقامات کی نشان دہی کر دی جہاں فکر انسانی کو ٹھوکر کھانے کا ذرا بھی خدشہ تھا۔ اس طرح کاروانِ شوق کی صحیح صحیح رہنمائی کر کے انسانیت پر عظیم احسان کیا۔

قدرت کاملہ نے مشیت تامہ کے تحت کائناتِ ارضی و سماوی کی تخلیق کی۔ کائناتِ ارضی کو جمادات، نباتات اور

حیوانات سے معمور کیا اور کائناتِ سماوی کو اجرامِ فلکی اور مجردات سے مزین کیا۔ کونین میں اپنی نیابت کے لئے اپنے شاہکار کو خلیفۃ الارض بنایا اور پوری کائنات کو اس کے لئے مسخر کر دیا۔ انسانی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے تاہل کی دولت عطا کی اس طرح خاندان کا وجود عمل میں آیا اور رفتہ رفتہ اس میں وسعت پیدا ہوتی رہی۔ جب انسانی زندگی قلت سے کثرت میں داخل ہوئی تو معاشرتی مسائل بڑھتے چلے گئے۔ خاندان سے قبیلہ بنا۔ بعد ازاں ملکی مسائل سامنے آئے اور پھر بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ انسان کو قدرت نے بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا تھا جس نے عقلی طور سے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ادھر قدرت بھی اس سے بے نیاز نہیں رہی۔ رشد و ہدایت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بالآخر دو قسم کے مذاہب معرضِ وجود میں آگئے ایک الہامی اور دوسرا عقلی۔ الہامی مذاہب کا سررشتہ ذاتِ اقدس کے ہاتھ میں ہے جس کے مبلغین انبیاء کرام ہیں اور عقلی مذاہب کا سرچشمہ انسانی عقل ہے اور اس کے مبلغین مختلف ادوار کے حکما و مفکرین ہیں۔ انسانی عقل و خرد نے ان مسائل کے حل کرنے کی جرأت تو کی جن کا تعلق حواسِ خمسہ کے ادراک سے ہے لیکن مابعد الطبیعاتی مسائل جو حیطۂ فکرِ انسانی سے باہر ہیں ان کے حل کرنے کے

سلسلے میں اُن کی تمام کاوشیں بے سود ثابت ہوئیں اس لیے کہ یہ مسائل عقل و خرد کے حدود سے باہر ہیں۔ الہامی مذاہب اپنے مبلغین کے دور تک تو اپنے صحیح خد و خال کے ساتھ پروان چڑھتے رہے لیکن ان کے جُدا ہوتے ہی بہت جلد عقلی مذاہب کے پیدا کردہ مسموم اثرات سے متاثر ہو کر اپنے صحیح خطوط سے الگ ہو گئے جس سے جزئیات تو جزئیات، کلیات پر بھی ضرب لگایا وحدانیت کا تخیّل، رسالت کا تصوّر، عبد و معبود کا تعلق، مابعدالطبیعاتی مسائل کے ایقان اور دیگر مبادیات کے تخیّل تک کو بدل دیا۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ گراں قدر کارنامہ ہے کہ آپؐ نے جزئی و کلّی تمام مسائل کا تشفی بخش، قابلِ عمل اور مکمّل ترین حل پیش کیا جو حرفِ آخر ہے۔ آپؐ نے وحدانیت کا نہایت صحیح اور نکھرا ہوا تصوّر پیش کیا۔ رسالت کے منصب اور فرائض کی عملی طور سے ترجمانی پیش کی۔ عبد و معبود کے رشتے کو حبل الورید سے مستحکم کیا۔ عقلِ مجرّد اور عشقِ الٰہی کا صحیح تصور عطا کیا۔ عالمِ مجردات سے با تفصیل آگہی بخشی۔ کائنات میں انسان کے مقام کی نشان دہی کی۔ فرد و جماعت کے حقوق و مطالبات کو واضح کیا اور ایک خدا پرستانہ نظامِ حیات کو روبہ کار لا کر مثال کے طور پر ابد تک کے لیے اتمام حجت کر دی۔ اپنی عملی زندگی سے فقر کے صحیح تصوّر کو جلا بخشا۔ انسانی خودی کی

تکمیل کا راز اطاعتِ الٰہی، عشقِ خداوندی، خودشناسی اور حق آگاہی قرار دیا اور ایسے صالح معاشرے کی طرح رکھ دی جو انسانیت کے لئے سراسر رحمت ہے۔ آپؐ نے انسانی فکر اور معتقدات سے لے کر عملی زندگی کے تمام نقائص و معائب کی اصلاح کر دی، قوائے شر کے تناور درخت کی بیخ کنی کر دی اور رہتی دنیا تک کے لئے انسانی زندگی کا وہ نمونہ پیش کیا جو امن و امان، صلح و آشتی کا ضامن اور جسم و روح کی پوری صلاحیتوں کے روبکار لانے کے لئے مواقع فراہم کرنے اور عقل و شعور کی بالیدگی اور طاغوتی قویٰ سے تحفظ کی آخری پناہ گاہ ہے۔

آپؐ کے اسوۂ حسنہ میں انسانی زندگی کا وہ مکمل اور جامع تصور پنہاں ہے جس کے لئے قرنہا قرن سے انسانی فطرت بے چین تھی۔ یہ انسانیت کا وہ شاہکار ہے جس پر خود قدرت کو بھی ناز ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہے کہ آپؐ کی تخلیق، قدرت کا معجزہ ہے۔ حضور صلعم کی پوری زندگی پیامِ قدسی کو پیش کرنے میں گذری۔ آپؐ کی سیرت طیبہ عالمِ طاغوتیت پر ایک ضرب کلیمی ہے اور ابد الآباد تک کے لئے معیارِ خیر و شر۔ آپؐ فطرت کی آبرو ہیں اور نہ صرف حیات کو حیات بخشنے والے ہیں بلکہ موت کو بھی تجدید مذاقِ زندگی

سے مشرف کرنے والے ہیں۔ آپؐ کائنات کے ذرّے ذرّے کو مہرِ تاباں بنانے والے ہیں۔ آپؐ کا پیام سرمدیت و ابدیت کا ضامن ہے۔ آپؐ خاتمِ سلسلۂ رسل ہیں۔ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کی اتّباع میں دنیاوی عزّ وجاہ اور اُخروی فوز و فلاح ہے آئیے آج ہم نہایت خلوص کے ساتھ اور صمیمِ قلب سے آپؐ کے اسوۂ حسنہ کی اتّباع کرنے کا عہد کریں۔ اور انسانیت کو قعرِ مذلّت سے نکال کر معراجِ کمال تک پہنچادیں۔ اس طرح منشارِ رسالت کو پورا کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادیں۔ آمین ثم آمین۔

عید الفطر کی اہمیّت

یہ ایک حقیقت مسلّم ہے کہ انسان کا وجود روح اور مادہ کے حسین اتصال کا مرہون منت ہے یہی وجہ ہے کہ اہلِ فلاسفہ میں روح اور مادہ کی بحثیں ہمیشہ نزاع طلب رہیں اور مختلف نظریات اس ضمن میں قائم کئے گئے لیکن پھر بھی عقلائے زمانہ اور فضلائے عصر کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ روح کو مادہ پر ہمیشہ تفوق و تقدم حاصل رہا ہے۔ روح ایک شئے مجردہ ہے جس میں لطافت بدرجۂ اتم موجود ہے برخلاف اس کے مادہ ایک کثیف شئے ہے جس میں جو کچھ بھی ہماہمی پائی جاتی ہے وہ روح کا مرہونِ منت ہے۔ روح کے بغیر مادہ ایک شئے عبث ہے۔

روح اور مادہ دونوں کے کچھ تقاضے ہیں۔ صانع حقیقی نے ان تقاضوں کی تسکین کے لئے تمام اسباب و وسائل فراہم کئے ہیں مادی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے خالق دو عالم نے آسمان سے زمین تک بیحد نعمتیں پیدا کی ہیں جن کا اجمالی تذکرہ کلام پاک میں کیا ہے اور کھلے لفظوں میں سوال کیا ہے۔ فَبِاَیِّ آلَاۤءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَان (سورۂ رحمٰن) جس کا ترجمہ یہ ہے :-

اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون نعمتوں کو جھٹلاؤ گے

خالقِ دو عالم نے جہاں اپنی قدرتِ کاملہ سے مادہ کی نشوونما کے لئے تمام کائنات کو پیدا کیا اور اس کو کثیرالتعداد مختلف النوع نعمتوں سے مملو کیا۔ وہاں روح کی پرورش، تہذیب اور بالیدگی کے لئے بھی سامان پیدا کئے اور اسی غرض و غایت کے تحت قادرِ مطلق نے پیغمبروں اور رسولوں کا ایک سلسلہ قائم کیا جو دنیا کے گوشہ گوشہ سے اٹھے اور حق کی آواز بلند کی۔ اس چشمۂ ہدایت سے برابر عالم سیراب ہوتا رہا۔ اور روحِ انسانی کو غذا فراہم ہوتی رہی۔ ان رہبرانِ دین پر صحائف اور کتبِ آسمانی نازل ہوتی رہیں۔ جن میں روحانی تقاضوں کے پیش نظر نسخۂ کیمیا درج ہوتا ہے۔ جن اقوام نے ان کو اپنایا روحانی امراض سے شفایاب ہوئیں۔ روحانیت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئیں اور جنہوں نے اس کا ابطال کیا قعرِ مذلت میں گریں۔ ہدایت یافتہ گروہ سے ایک صحتمند معاشرہ کا وجود عمل میں آیا۔ جس نے صحیح معنوں میں صفحۂ ارض پر نیابتِ الٰہی کی اور سرخروئی حاصل کی۔

یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ ابتدائے آفرینش سے روحانی قوتوں کے ساتھ طاغوتی قوتیں بھی برابر سرگرمِ عمل رہیں اور ہمیشہ انسانی زندگی میں روح اور مادہ کے صحیح مقام کے متعین ہونے کی راہ میں مزاحم رہیں۔ کبھی تو پرفریب روحانیت کی طرف اس قدر مائل کیا کہ راہب بنا کر گوشۂ تنہائی میں جا بٹھایا اور

کبھی مادہ کی اہمیت کو اس قدر مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کیا کہ اشتراکی بناکر روح کے وجود تک سے انکار کر دیا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ دونوں نے یہ سب کچھ محض تلاشِ حقیقت میں کیا لیکن ایک راہبانہ زندگی میں گم ہوکر رہ گیا اور دوسرا مادیاتی ذرّوں تک پہنچ کر خود فراموش ہوگیا اور نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔

یہ محض اسلام کا احسان ہے کہ اس نے انسانی زندگی میں روح اور مادہ کے مقام کو متعین کیا۔ اس نے نہ تو مادّی تقاضوں سے انکار کو جائز قرار دیا اور نہ تو روح کو سب کچھ قرار دیا۔ اس نے نہایت ہی حسین توازن پیدا کیا۔ ویدانت اور مغرب کے دیگر قدیم مکتبِ خیال نے جو یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ مادّہ روحانی ترقی کی راہ میں حارج ہوتا ہے۔ اسلام نے اس کی پرزور تردید کی اور بتایا کہ مقررہ حدود و قیود کے اندر رہ کر انسان مادّی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے روحانیت کے اعلیٰ مراتب طے کر سکتا ہے۔ اور سدرۃ المنتہیٰ سے پرے پرواز کرتے ہوئے قرب الٰہی حاصل کر سکتا ہے جو تمام روحانی جدوجہد کی آخری منزل ہے۔

اسلام نے دنیا کو دار العمل قرار دیا ہے اور عقبیٰ کو دار الجزا۔ اس نے بتایا کہ جو شخص حرص و آز، کذب و افترا اور دیگر تمام خواہشاتِ نفسانیہ کی خاردار جھاڑیوں سے بچتا ہوا آگے نکل جائے۔ اور روحانیت کے منازل طے کرتا چلا جائے۔ وہ متقی ہے

اسی کے لئے دین و دنیا کی تمام کامرانیاں اور شادکامیاں ہیں اور صحیح معنوں میں وہی کامیاب ہے۔

تقویٰ کی منزل کے حصول کے لئے حکیم مطلق نے جو نسخہ تجویز کیا ہے اس ضمن میں دو قسم کی ہدایات ہیں ایک تو نسخہ پر عمل کرنے کا شدت سے حکم ہے اور دوسرا چند چیزوں سے اجتناب کا بھی اسی شدت سے حکم ہے۔ تقویٰ کی منزل کے حصول کے لئے جس نسخۂ کیمیا پر عمل کرنا لابدی ہے اس کے پانچ اجزا ہیں۔ (۱) ایمان۔ (۲) نماز (۳) روزہ (۴) زکوٰۃ (۵) حج اور جن منہیات سے اجتناب ضروری ہے وہ "فحشا" اور "منکر" ہیں۔

يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ط

اس نسخۂ کیمیا پر اگر شدت سے عمل کیا جائے اور منہیات سے دور رہا جائے تو تقویٰ کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔ محض ایک جست میں روحانیت کے اعلیٰ مدارج طے ہو جاتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر مرد کامل، مرد مومن بن جاتا ہے جو محبوب خدا اور محبوبِ رسول ہوتا ہے جس کی ایک نظر سے زمانہ کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ وہی صحیح معنوں میں خدا کا خلیفہ ہوتا ہے جو سارے عالم کے لئے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔

درج بالا نسخہ پر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایمان اور نماز کے بعد اس کا سب سے اہم جزو روزہ ہے۔ اس کے

فضائل کلام پاک اور حدیث نبوی میں کثرت سے درج ہیں۔ اس کا فیضان ہر کہہ و مہ پر یکساں پڑتا ہے اور اس پر صحیح طور سے عمل کرنے سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو نہایت صالح ہوتا ہے۔ ہر قسم کی کثافتوں سے پاک ہوتا ہے اور جمیع فضائل و حسنات سے معمور ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ کے افراد میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو معراج انسانی کے لئے لابدی ہیں۔ صبر قناعت، ضبط، نفس کشی، انسانی ہمدردی، اطاعت الٰہی اور تسلیم و رضا وغیرہ وغیرہ وہ چند محاسن ہیں جن سے ایک روزہ دار کی زندگی مزیّن ہوتی ہے۔

احکامِ الٰہی کے دو پہلو ہیں۔ ایک ایجابی اور دوسرا سلبی، پہلے میں اثباتی احکام ہیں جن کے کرنے کا حکم ہے اور دوسرے میں منفی احکام ہیں جن سے ممانعت کی گئی ہے۔ رمضان کے سلسلہ میں احکامِ الٰہی کا سلبی پہلو کارفرما ہے۔ اس میں اکل و شرب و مباشرت وغیرہ جو مقررہ حدود کے اندر قطعی جائز ہیں دورانِ روزہ میں ایک روزہ دار پر قطعی حرام ہو جاتے ہیں اور شدت سے ان کی ممانعت کی جاتی ہے۔ ایک روزہ دار رضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے اس لئے کہ اس کی پوری زندگی مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ وہ خندہ پیشانی سے ان تمام احکامات کو قبول کر لیتا ہے اور ان کے سامنے سرِ نیاز خم کر دیتا ہے اور وہ تمام چیزیں بھی اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے جن کے غیر رمضان میں حلال ہونے پر بعض دال ہی

علم نفسیات کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ تواتر اور تکرار کے ساتھ جو فعل انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ انسانی فطرت میں راسخ ہو جاتا ہے اور اس کی سوتیں انسانی فطرت کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور یہ خصلت راسخہ فطرت انسانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کو چھوڑنا مشکل ہی نہیں محال ہوتا ہے۔ رمضان کے مہینہ میں عمل خیر کی تکرار ہوتی ہے اور ایک ماہ تک مسلسل خدا اور رسول کے احکام کی پابندی نہایت شدت سے کی جاتی ہے نماز، روزہ، تراویح، تلاوت کلام پاک، ورود و وظائف، مجاہدہ اور مراقبہ اور تہجد وغیرہ کی وجہ سے تصفیہ ظاہر کے ساتھ ساتھ تصفیہ باطن بھی ہو جاتا ہے اور اس طرح روح اور مادہ دونوں کی تہذیب حاصل ہوتی ہے اور انسان کا قلب اتنا مجلا ہو جاتا ہے کہ اس پر انوارِ الٰہی کی بارش ہمہ دم ہوتی رہتی ہے اور مرد مومن اس منزل ارتقا کو حاصل کر لیتا ہے جس کی طرف خدائے پاک پروردگار نے درج ذیل آیت میں اشارہ کیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ؕ

اس سے ظاہر ہے کہ روزہ، نماز، زکوٰۃ اور حج وغیرہ مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ منزل ارتقا کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

رمضان شریف ایسا پاک اور متبرک مہینہ ہے جس کی بزرگی اور فضیلت پر نص دلالت کرتی ہے اس میں اس نسخہ کیمیا کا نزول

ہوا جو سارے جسمانی اور روحانی آلام و امراض کا واحد علاج ہے اور شفائے کامل کا ضامن۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ ط

علاوہ بریں اس میں آسمان سے ہمہ دم رحمت کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ یہ منظر کیسا جان آفریں ہوتا ہے جبکہ ایک پوری قوم خدا اور رسول کے حکم کے تحت ایک سخت آزمائش سے خنداں و فرحاں عہدہ برآ ہوتی ہے، تسبیح و تہلیل میں وقت گذارتی ہے۔ دن کو تلاوت قرآن پاک کرتی ہے اور رات تراویح، مجاہدہ اور تہجد ادا کرنے میں بسر کرتی ہے۔ اس کی پوری زندگی رضائے الٰہی کا مرقع ہوتی ہے۔ اس میں شب قدر کی ایک ایسی رات آتی ہے جو ہزار دن راتوں سے افضل ہے اس کی فضیلت پر سورۂ قدر دال ہے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ (قدر کی رات ہزار مہینے سے بہتر ہے)

اس مہینے میں انسان کی تمام باطنی طاقتیں عود کر آتی ہیں۔ اس میں صلہ رحمی، ترحم، تشکر، باہمی ہمدردی اور نفس کشی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ نفسِ امارہ مردہ ہو جاتا ہے اور نفس لوامہ اپنی پوری طاقتوں کے ساتھ ابھر آتا ہے۔ ضبط و صبر کی وہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ تشدد اس کے سامنے دم توڑ دیتا ہے۔ ایسی قوم سے دنیاوی با جروت طاقتیں بھی آنکھ ملاتے ہی تھرا جاتی ہیں۔ ان کے پائے ثبات میں زلزلہ پیدا ہوتا ہے اور بڑی سے بڑی مادی قوتیں جب اس سے ٹکراتی ہیں

تو ان کی دھجیاں اُڑ جاتی ہیں۔

لیکن افسوس صد افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج نہ ہماری وہ نماز ہے جو معراج المومنین ہے، نہ وہ روزہ ہے جس کا اسلام طالب ہے۔ نہ وہ زکوٰۃ ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی شرط اوّلین ہے۔ اور نہ وہ حج ہے جس میں ریا اور ظاہر داری سے اجتناب از حد ضروری ہے۔ یہی منافقت، ریا کاری اور نام و نمود کا ہوس ہے جس کی وجہ سے آج ہمارا تمام کام ایک جسم بے روح کے مانند ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان سے وہ تمام فوائد مترتب نہیں ہوتے جن کی ضمانت خدا اور رسول نے دی ہے۔ آج عزت کے بجائے ذلّت، قوت کے بجائے ضعف اور ثروت کے بجائے نکبت مسلمانوں کے لیے مقدر ہے اس کی وجہ ظاہر ہے، کہ نسخہ کا صحیح استعمال نہیں ہو رہا ہے اور جب نسخہ سے عدم توجہی برتی جا رہی ہے تو مرض سے شفا معلوم۔

عید کے معنی خوشی کے ہیں اور یہ خیر و خوبی سے خدا اور رسول کے تمام بتائے ہوئے احکام کے مطابق بسر کرنے کے بعد منائی جاتی ہے۔ حقیقت میں عید اس کے لئے ہے جس نے رمضان کے دن عبادت اور راتیں ریاضت میں بسر کی اپنے تمام نفسانی تقاضوں کو خدا اور رسول کی رضا پر قربان کر دیا۔ اپنے ظاہر اور باطن کو سنوارنے کی سعی بلیغ کی ایسے ہی لوگ متقی ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ وَاَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُوْنَ ط

عید کا اسلامی تصوّر

خوشی و غم لازمۂ حیات انسانی ہیں۔ قدرت کاملہ نے دونوں کو توام پیدا کیا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایک کا وجود دوسرے کے وجود کو متلازم ہے۔ خوشی خوشی نہیں ہے اگر جذبہ غم سے عاری ہے اور غم غم نہیں ہے اگر خوشی مفقود ہے۔ بلکہ بعض مفکر کا یہ کہنا ہے کہ خوشی منتہائے غم ہے اور غم منتہائے خوشی کے رنگین اور بھرپور جذبات اپنے نقطۂ عروج پر قطراتِ اشک بن کر جذبۂ غم کی ترجمانی کرتے ہیں اور وفورِ مسرت سے انسان قہقہہ لگا اٹھتا ہے۔

یہ ایک مسئلہ قانون فطرت ہے جس سے کوئی مخلوق عاری نہیں، کہ غم والم، ابتلا و آزمائش کے بعد مسرت کے لمحات زیادہ رنگین اور کیف آگیں ہوتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ کوئی قوم اس صفحۂ ارض پر روزِ ازل سے آج تک نہیں پائی گئی جس کی زندگی ہمیشہ مسرت آگیں لمحات سے معمور ہو۔ کبھی عیش و عشرت کا دور دورہ رہا تو کبھی غم والم کی فراوانی اور کبھی قدرت کی آزمائش اس تواتر کے ساتھ ہوئی کہ مسرت کے لمحات آنے بھی نہ پاتے کہ غم کا کانٹا چبھ جاتا۔ اسی کشمکش میں

زندگی کے پورے ایام گذر جاتے۔ کامیاب وہ رہا جس نے غم کے ایام میں صبر و ضبط سے کام لیا اور خوشی کے ایام میں جذبۂ تشکر سے۔ یہی ایک حقیقی مرد مومن کی شان ہے۔

ماہ صیام بھی ہر سال مومن کی متاعِ ایمانی کی سخت آزمائش ہے۔ بھوک کی شدت، پیاس کا غلبہ، نفسِ امارہ کی ترغیب، قوائے شر کی تحریص اور نظامِ طاغوت کی فتنہ پردازی کا ہر آن اور ہر لمحہ مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ بجز قوتِ ایمانی کے اس کے پاس دنیا کی کوئی قوت ایسی نہیں ہوتی جو شدتِ تشنگی میں اس کے لبوں کو لبالب جام شیریں کے ایک آدھ قطرہ سے باز رکھ سکے۔ اسے بھوک کی شدت کے وقت اپنے گھر کے کسی گوشہ میں ایک آدھ لقمۂ تر فرو خلق کرنے سے روک رکھے۔ یا کسی بھی عمل شر سے اسے مجتنب رکھے۔ ایسے لمحات ایک مومن کی زندگی میں سراسر آزمائش ہیں قدرت اسے بار بار آزماتی ہے۔ اور ہر سال اسے آزمائش کے اس دور سے گذرنا ہوتا ہے۔ جو شخص آزمائش کی اس تپتی اور دہکتی ہوئی بھٹی سے صحیح اور سالم نکل آتا ہے۔ وہ کندن بن جاتا ہے۔ اُس کی کیفیت پارس پتھر جیسی ہو جاتی ہے۔ تمام روحانی کثافتیں ایمان کی حرارت سے جل بھن کر خاکستر ہو جاتی ہیں اور قوتِ ایمانی نکھر آتی ہے۔

رمضان شریف کی آزمائش اور روحانی جدوجہد سے جب مومن کما حقہٗ عہدہ برآ ہوتا ہے تو وہ لمحات فطری طور پر اس کے لئے

بہت ہی رنگین، پرکیف اور مسرت آگیں ہوتے ہیں۔ اس کا غنچۂ دل کھل اٹھتا ہے اور وہ ایک ایسی لطیف روحانی مسرت محسوس کرتا ہے جو حیطۂ بیان سے باہر ہے۔ اس کو صرف وہ خوش نصیب مردِ مومن ہی محسوس کرسکتا ہے جو قدرت کی سخت روحانی اور جسمانی آزمائش سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوتا ہے۔ وہ روزِ سعید، قوّتِ خیر کی کامیابی کا روز ہوتا ہے۔ اس روز قوتِ شر مغضوب ہوتی ہے۔ قوتِ ایمانی میں ابدی جِلا پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان روحانی طور پر تقویت محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ دن اس کی زندگی کا سب سے کامیاب، بارونق اور عشرت بداماں ہوتا ہے۔ اس کا گلنار چہرہ اور بشرہ اس پر دال ہوتا ہے۔ وہ غیر محسوس طور پر روحانیّت کے مختلف منازل طے کر چکا ہوتا ہے اس لئے اسے سکون ذہنی اور طمانیتِ قلب حاصل ہوتی ہے۔ اس کے چہرہ پر ایک پر وقار روحانی متانت اور جاذب نظر شگفتگی ہوتی ہے۔ وہ شیطنت سے بعید اور الوہیت سے قریب تر ہوتا ہے۔ اس کی نظروں میں جاذبیت، تیور میں کشش، پیشانی میں پرُ وقار سنجیدگی اور لبوں پر دلفریب تبسم رقصاں ہوتا ہے۔ اس روز تمام فضا مسرور ہوتی ہے۔ اور قدرت کاملہ دل کھول کر عالمِ ارضی پر اپنے فیض و کرم اور رحمت کی بارش شروع کر دیتی ہے۔ عرش سے فرش تک روحانیت کے مسرور کن ذرّات رقصاں ہوتے ہیں۔

یہ وہ روز سعید ہے جسے عید کے خوش کن اور مسرت آگیں

نام سے موسوم کرتے ہیں۔ عید کے معنی ہی خوشی و مسرت کے ہوتے ہیں۔ یہ وہ بابرکت دن ہے جو خدائے لم یزل کے احکام کی تعمیل، صبر و ضبط اور تحمّل و استقلال کے ساتھ کرنے والے بندوں کے لئے پیامِ مسرت لاتا ہے۔ طمانیتِ قلب بخشتا ہے۔ اور حقیقی فوز و فلاح کی ضمانت دیتا ہے۔ قوائے شر کے پے بہ پے یلغار کی وجہ سے مردِ مومن کے ذہن و روح پر جو تکدر چھایا ہوا رہتا ہے وہ یک لخت دور ہو جاتا ہے اور اس کا چہرہ دمک اٹھتا ہے۔ وہ حقیقی مسرت اور خوشی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس لئے کہ جو خوشی ابتلا یا آزمائش کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ وہ زیادہ دلکش اور بھرپور ہوتی ہے۔ اس روز قدرت نے بھی اس کو خوش رہنے کا حکم دیا ہے اور کسی آزمائش کو اپنے اوپر طاری کرنے کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ قدرت کا یہ منشائے واضح ہے کہ اس روز سوائے خوشی و اظہارِ تشکر کے اور کچھ نہ کیا جائے۔ جو اس کی روح کے منافی ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی دیگر اقوام بھی کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی نام سے عید مناتی ہیں لیکن ان کی عید اور اسلامی عید میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کی عید میں وہ حقیقی مسرّت اور خوشی کے جذبات مفقود ہوتے ہیں جو اسلامی عید کے طرۂ امتیاز ہیں۔ کیونکہ اسلامی عید ایک ماہ کی مسلسل جدوجہد اور آزمائش کا ماحصل ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اغیار اکثر و فورِ مسرت

میں جذبات کو ڈھیل دے دیتے ہیں۔ اور حیوانیت کو چھوٹ مل جاتی ہے۔ وہ تمام اخلاقی، سماجی اور انسانی حدود کو توڑ کر نفس اَمّارہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسلامی عید اس قسم کی کثافتوں سے پاک ہوتی ہے۔ اس میں شریعت و اخلاق کے فطری حدود کا پاس رکھنا ازبس ضروری ہوتا ہے۔ یہاں جذبات کو بے لگام نہیں چھوڑا جا سکتا۔ نفس امارہ کی یہاں ایک بھی نہیں چلتی۔ یہاں انسان خوشی اور مسرت کے بھرپور لمحات میں بھی اخلاقی توازن کو برقرار رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہاں انسان حیوان نہیں ہوتا ہے بلکہ ماقبل سے زیادہ بہتر اور بلند تر انسان ہوتا ہے۔ وہ قدرت کا ایسا انمول اور نادر شاہکار ہوتا ہے جس پر خود قدرت بھی نازاں ہوتی ہے۔

یہ ہے ہماری عید اور اس کا ایک ہلکا سا پرتو۔ اس کا احترام، اس کے قواعد و ضوابط کی پابندی اور اس کے واجبات کی ادائیگی ہر مردِ مومن پر فرض ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ وہ عید کے روز احتسابِ نفس کرے۔ اور اگر یہ محسوس کرے کہ ماہ صیام کے قبل جیسا مسلمان تھا اس سے وہ بہتر ہو گیا ہے تو وہ عید اس کے لئے روزِ سعید ہے۔ ورنہ وہ روز ایسا ہی ہے جیسا سال کا کوئی اور دن۔

رزمِ خیر و شر

خیر و شر کی کش مکش روز ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس میں کبھی خیر کی فتح ہوتی ہے تو کبھی شر کی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ شر کی فتح عارضی ثابت ہوتی ہے اور خیر کی ابدی۔ پھر بھی شر کی طاقتیں قویٰ خیر سے الجھتی رہتی ہیں اور کبھی بھی اپنی شکست کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتی ہیں۔ یہ رزم گاہ خیر و شر انسان کے لئے امتحان گاہ ہے۔ اسی میں انسان کی سعادت و شقاوت کی پرکھ ہو جاتی ہے جو خیر کی موافقت کرتا ہے۔ وہ نجات یافتہ ہوتا ہے اور جو شر کی حمایت کرتا ہے وہ سعادت اخروی سے محروم رہتا ہے۔

خیر و شر کی اسی باہمی آویزش سے دامن تر کئے بغیر نکل جانا بحر ظلمات طے کر کے آب حیات حاصل کر لینے کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ اس حال میں انسان کی کس مپرسی کا نقشہ درج ذیل شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔ ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

حق و باطل کی اس کش مکش کا پہلا مظاہرہ طاغوت اعظم کی

سرکشی اور تمرّد سے ہوا تھا۔ اسی وقت سے شر و باطل کی طاقتیں ابلیس کی شکل میں مشخّص ہوگئیں اور آدم کے ہبوط ارضی اور ابلیس کے مردودِ بارگاہ ہونے کے بعد طغیان و سرکشی کا منظم نظام معرضِ وجود میں آیا۔ اس نے انسان کو ایک سخت آزمائش میں ڈال دیا۔ جنت سے نکلوایا۔ اس پر بھی اس نے اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی ہمہ دم کوشش یہ ہے کہ انسان اپنے مستقر ازلی (جنت الفردوس) کے استحقاق سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوجائے اور دوزخ کا ایندھن بن جائے۔ عوام و خواص سب کو قعرِ مذلّت میں ڈالنے کی یہ کوشش ہمہ دم جاری ہے۔ حضرت حوّاؑ کے ذریعہ حضرت آدمؑ کو مغالطہ دلاکر جنت الفردوس سے محروم کرنا، حضرت نوحؑ کے دل میں اولاد کی محبّت پیدا کرنا، حضرت اسمٰعیلؑ کو ورغلانا، نمرودؔ، شدّادؔ، فرعونؔ، ابوجہل اور ابولہب کی شکل میں حقانیت کے خلاف صف آرا ہونا اس کے مہتم بالشان کارنامے ہیں۔ آج بھی اسلام میں دینِ حق سے بیزاری پھیلانا، لادینیت کو شہ دینا، انسان پر انسان کی خدائی مسلط کرنا اور خدا کی خدائی میں دخیل ہونے کی کوشش کرنا اور ازیں قبیل شر و فساد پیدا کرنے کی ہمہ دم کوشش کرنا اس کی فطرتِ ازلی ہے۔

حق و باطل کی اسی کشمکش نے بہت سے نئے نئے فتنے پیدا کئے ہیں۔ ورودِ اسلام کے قبل تمرّد و طغیان اور سرکشی کے جو

واقعات رونما ہوئے تو وہ تو ہوئے ہی۔ مزید برآں اس دینِ حنیف کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد بھی اس نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئیے جس سے امّتِ مسلمہ کا شیرازہ یکسر منتشر ہوگیا۔ آج بہتر (۷۲) فرقوں کا وجود اس کے افتراق پر دال ہے جس سے وحدتِ فکر پارہ پارہ ہوگئی ہے۔ اس نے فتنۂ ارتداد، فتنۂ خوارج، فتنۂ خلق قرآن، فتنۂ باطنیہ، تحریک بابی اور علیٰ ہذا القیاس بہت سے فتنوں کے دروازے کھول دئیے۔ اس کی چابکدستی اور کامرانی کی یہ ادنیٰ مثال ہے کہ آج دو مسلمان بھی ایسے نہیں ملتے جو کسی بات میں کماحقہٗ متفق ہوں وہ قوم جو تمام اقوامِ عالم کی سیادت کے لئے منتخب ہوئی تھی اور قدرت نے اسے صفات وکمالاتِ انسانی سے متصف کیا تھا آج ذلت ونکبت کے اس غارِ عمیق تک پہنچ چکی ہے۔ جس کا تصوّر بھی جان لیوا ہے۔

ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

خیر وشر اور حق وباطل کی یہ کشمکش جو روزِ ازل میں ایک سجدہ کی نافرمانی سے شروع ہوئی تھی اور بڑھتے بڑھتے کتنے حوادث فاجعہ کا باعث ہوئی وہ معرکہ کربلا تک پہنچتے پہنچتے اپنے نقطۂ منتہیٰ تک پہنچی ہے۔ حق پر باطل کا یہ ایک بھرپور وار تھا۔ جو عارضی طور پر کامیاب ہوکر بھی ناکامیاب رہا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے سب کچھ لٹا کر اتمامِ حجت کردیا۔ اور آپ نے تاریخِ عالم پر یہ

نشان ثبت کردیا کہ حق کے مقابلہ میں کسی شے کی کوئی قیمت نہیں ہے اور اس طرح آپ نے رضائے ایزدی حاصل کرلی اور قیامت تک کے لئے سرخروئی سے سرفراز ہوئے۔ آپ نے انسانیت اور حقانیت کی لاج رکھ لی۔ سب کچھ کھو کر بھی سب کچھ پالیا۔ عقبیٰ کے لئے دنیا کو نثار کردیا اور یہ ثابت کردیا کہ اگر کبھی زندگی جاں ہے تو کبھی تسلیم جاں بھی اور زندگی کا یہ مقام بہت بلند ہے۔ آپ نے انسانی تاریخ میں یہ حقیقت بخط جلی اپنے خونِ پاک سے لکھ دیا کہ باطل کے سامنے جھکنے سے سر دینا بدرجۂ اولیٰ بہتر ہے۔

سچ کہا ہے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے۔

شاہ است حسینؓ بادشاہ است حسینؓ
دیں است حسینؓ دیں پناہ است حسینؓ

سر داد، نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؓ

یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی تاریخ میں یہ واقعہ نہایت ہی ممتاز حیثیت کا مالک ہے اور حق کے لئے جاں سپاری اور جاں بازی کے باب کا یہ خطِ جلی عنوان بنا ہوا ہے۔ کروڑوں انسان ایسے ہیں جن کا دل آج بھی اس حادثۂ دلخراش اور جانکاہ کو یاد کرکے خون کے آنسو بہاتا ہے۔ عرصۂ کارزار میں حضرت امام حسینؓ کی مادی شکست انسانیت کی لاج ہے۔

اور حقانیت کی آبرو!

اس واقعہ نے انسانیت کی کلاہِ افتخار میں ایک زرّیں پر کا اضافہ کر دیا۔ اور انسانی ارتقا کے اس فیصلہ کن موڑ پر حق کو دائمی فتح و کامرانی سے نوازا۔ اور شہدائے کربلا کو حیاتِ جاودانی عطا کیا اس لئے کہ بقولِ حافظ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

روزہ کا اِسلامی تصوّر

روزہ کو عربی میں صوم کہتے ہیں۔ اور صوم کے معنی امساک کے ہیں یعنی رکنا اور بچنا منہیات سے۔ پس معروف کا التزام اور منکر سے اجتناب' روزہ کی اصل ہے اس میں جہاں ایک طرف کثرت سے عبادت اور ریاضت کرتے ہیں۔ مجاہدہ سے کثافت روحانی کو دور کرنے کی سعی کرتے ہیں دوسری طرف منہیات، مناکیر و فواحش سے ہر آن و ہر لحظہ جسم و روح کو پاک رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ منہیات سے بچنے کے معنی اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے۔ اس کا مفہوم صرف مناکیر سے اجتناب ہی نہیں ہے بلکہ تقدس، خداترسی اور تقویٰ کے جوہر سے اپنے کردار کو مزیّن کرنا ہے۔ اس سے انسان کے روحانی' جسمانی اور اخلاقی امراض و علل کا کماحقّہٗ علاج ہو جاتا ہے۔ اور ایک صحت مند زندگی عود کر آجاتی ہے۔ روزہ کی فرضیت کے بارے میں خدائے پاک نے اپنے صحیفۂ مقدّس میں فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ط

[اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔]

اس آیت کی مندرجہ ذیل شقیں قابلِ توجہ ہیں :-

(۱) اس میں تخاطب ایمان والوں سے ہے

(۲) مومنوں پر روزہ فرض ہے۔

(۳) زمانۂ سابق میں بھی مختلف امتوں پر روزہ فرض تھا۔

(۴) روزہ کا مقصود اصلی تقویٰ حاصل کرنا ہے۔

پہلی شق کی وضاحت سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ صاحبِ ایمان پر روزہ فرض ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مومن ہونے کا مدعی بھی ہو اور روزہ کی فرضیت سے انکار بھی کرے۔ گرچہ آج بعض تیز و طرار طبیعتیں اس کو ایک خاص زمانہ تک محدود کرنا چاہتی ہیں۔ اور یہ منطق پیش کرتی ہیں کہ یہ حکم اُس دور کے لئے مخصوص ہے جبکہ اہلِ عرب فاقہ مست تھے اور روزہ کے ذریعہ ان کو ان کی فاقہ مستی پر قانع کرنا تھا۔ یہ نہایت ہی پوچ اور لچر منطق ہے اور اشتراکیت کے مہلک و مضر جراثیم سے متاثر ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ایسے ذہن کی تکفیر لابدی ہے اور اس کے دور رس مضر اثرات کی نشان دہی ازبس ضروری ہے۔ ایسے حضرات کو اسلام کا لبادہ

اوڑھ کر اسلام کے بغل میں گھونسہ لگانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور ایسے حضرات کو اپنے ہوا و ہوس کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کے بجائے اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ روزہ کا تعلق فاقہ مستی سے قطعی نہیں ہے۔ اگر فاقہ ہی کو روزہ کا حاصل تصوّر کیا جائے تو جتنے غربا و مساکین ہیں جو ایک دن ہی نہیں کتنے دن پیٹ پر پتھر باندھ کر گذار دیتے ہیں۔ سب سے بڑے روزہ دار تصوّر کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ ان کو فاقہ زدہ کہا جا سکتا ہے۔ روزہ دار نہیں کہا جا سکتا اور اس قسم کے فاقہ پر قانع ہونا اسلام کا مقصد ہرگز نہیں ہے۔ پس ایسے حضرات جو روزہ رکھتے ہیں اور روزہ کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کرتے ہیں۔ فاقہ مست ہیں وہ روزہ دار نہیں کہے جا سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"بہت روزہ دار ایسے ہیں کہ اُن کے روزہ کا کوئی مقصد نہیں بجز اس کے کہ وہ بھوک و پیاس میں وقت گذاریں اور اور بہت سی راتوں کو نماز پڑھنے والے ایسے ہیں کہ شب بیداری کے سوا ان کی نماز کی کوئی غرض و غایت نہیں"

پس یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بھوک اور پیاس سے اجتناب ہی روزہ کا مقصد نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد بہت بلند اور

ارفع ہے جس کی وضاحت آئندہ کی جائے گی لہٰذا ایک مومن
پر روزہ اپنے تمام ضروری تقاضوں کے ساتھ فرض ہے اور
مومن رہتے ہوئے اس سے انکار کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔
تیسری شق اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے
کہ زمانۂ سابق میں مختلف امتوں پر روزہ ایسے ہی فرض تھا
جیسے مسلمانوں پر فرض ہے۔ آج بھی ان امتوں سے متعلق جو
لوگ ہیں وہ روزہ کا التزام کرتے ہیں۔ گرچہ اُن کے اور
مسلمانوں کے روزہ میں جزئی طور سے کچھ فرق بھی ہے۔ حضرت
آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ تک مختلف پیغمبروں نے مختلف طریقہ
سے روزہ کا التزام کیا۔ کیونکہ روزے ان پر فرض تھے۔ حضرت
آدمؑ پر ہر ماہ کی تیرھویں، چودھویں اور پندرہویں تاریخ کے
روزے فرض تھے، حضرت نوحؑ ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے۔
حضرت داؤدؑ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے
تھے۔ یہودیوں پر یوم عاشورہ اور ہر سنیچر کو روزہ فرض تھا۔
علاوہ بریں کچھ اور دنوں کے بھی روزے فرض تھے۔ نصاریٰ
پر حقیقتاً رمضان ہی کے روزے فرض تھے۔ لیکن طبیعت کی
تساہل پسندی نے موسم گرما و سرما کی شدتوں سے محفوظ
رہنے کے لئے موسم ربیع کو اس کے لئے مخصوص کر لیا۔
پس اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ حضرت آدمؑ

سے لے کر آنحضرت صلعم تک روزے کے اوقات و تعداد میں جو فرق رہا ہو وہ ہو لیکن روزہ کی فرضیت میں چنداں فرق نہیں رہا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں پر روزہ کو فرض کر کے اُن کو کوئی نئی تکلیف نہیں دی گئی بلکہ روح و جسم کو آلائش سے منزّہ کرنے کے لئے اس نسخہ کو بار بار دہرایا گیا جس پر بہت سے انبیاء و صلحا عامل رہ چکے تھے۔ اور اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

آیت مذکور کی اخیر شق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روزہ مقصود بالذّات نہیں ہے بلکہ اِس کے ذریعہ تزکیۂ نفس مقصود ہے یعنی تہذیب نفس اور روحانیت کے اعلیٰ ترین منازل کا حصول اس کا مقصدِ اصلی ہے۔ پس جس نے روزہ رکھا اور تقویٰ کے گوہر سے محروم رہا وہ بھوکا رہا، پیاسا رہا۔ ایسے روزے کی خدا کو حاجت نہیں ہے۔ روزہ کا جوہر تقویٰ ہے۔ پس جس نے روزہ رکھا اور متقی بن گیا اُس نے گوہر مقصود پایا اور یہ اس وقت ممکن ہے جب انسان روزہ کو اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ پورا کرتے ہوئے رکھے۔ تب ہی وہ اتقا کے ارفع و اعلیٰ منزل پر متمکن ہو سکتا ہے اور اُسی کی طرف اس ٹکڑے میں نشان دہی کی گئی ہے۔

روزہ کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ایک ماہ کے روزہ کا التزام۔

(۲) اس ماہ میں قرآن پاک کا نزول۔

(۳) آخر عشرہ کی طاق راتوں میں شبِ قدر کا ہونا اور اس میں اعتکاف کرنا۔

(۴) سحر و افطار۔

(۵) تراویح۔

مسلمانوں پر جو روزہ فرض ہے وہ ایک یا دو دن کا نہیں بلکہ سال میں مستقل ایک ماہ کا ہے۔ ماہ شعبان کے بعد چاند رات سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور ایک ماہ کے بعد ماہ شوال کے چاند رات کے نمودار ہوتے ہی اس کا اختتام ہوجاتا ہے۔ اس ماہ کو خدائے پاک نے اپنی بے پایاں رحمتوں سے معمور کردیا ہے۔ اس ماہ کے ہر عشرہ میں فیضانِ رحمت ہوتی ہے۔ اور روزہ دار کو فیضیاب کردیتی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

هُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَاٰخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ

خلاصہ یہ ہے کہ اس ماہ کا عشرۂ اوّل رحمتِ خداوندی کے نزول کے لئے مخصوص ہے۔ عشرۂ دوئم میں صائم کی مغفرت ہوتی ہے اور عشرۂ آخر میں اُسے دوزخ کی آگ سے نجات دے دی جاتی ہے۔ یہ مہینہ فیوض و برکات سے پُر ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس ماہ کو پایا اور اپنی

عاقبت سنوار لی اور بدنصیب ہیں وہ جنہوں نے اس ماہ کو پایا اور رحمت سے محروم رہے۔

اس مہینہ کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس میں قرآن مجید کا نزول ہوا۔ اور قدرت نے انسانیت کو کامل ترین ضابطۂ حیات عطا فرماکر گراں بارِ احسان کیا۔ مندرجہ ذیل سورہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

"آج میں نے تمہارے واسطے تمہارے دین کو پورا کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری فرمادی اور تمہارے واسطے اسلام دین کو پسند کیا۔"

قرآن پاک کے نزول سے اس ماہ کا تقدس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ رسولؐ ماہ رمضان کی راتوں میں جبرئیلؑ کو قرآن پاک سناتے تھے۔ حضورؐ قاری ہوتے اور جبرئیلؑ سامع، یہی وجہ ہے کہ اس ماہ میں بالخصوص کلام پاک کا پڑھنا، ورد کرنا، سننا اور سنانا، باعثِ برکت و رحمت ہے۔ قرآن کے نزول کے بارے میں خدائے پاک نے فرمایا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ط

(رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن مجید اُتارا گیا)

اس ماہ کی تیسری صفت جو اسے دوسرے مہینوں سے ممیز کرتی ہے وہ اُس کے آخر عشرہ کی طاق راتوں میں لیلۃ القدر کا واقع ہونا ہے۔ یہ ایک ایسی رات ہے جو ہزار ماہ سے بہتر ہے۔ اس میں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ تقدیریں بدل سکتی ہیں ملائکہ و ارواحِ پاک کا نزول ہمہ دم تا صبح ہوتا رہتا ہے۔ سورۃ القدر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ ملاحظہ ہو اور اسی، آخر عشرہ میں اعتکاف، سنت مؤکدہ کفایہ ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۚ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۚ لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۚ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۚ سَلٰمٌ ۚ هِیَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ؕ

(تحقیق ہم نے نازل کیا قرآن مجید کو قدر کی رات میں۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ قدر کی رات کیا ہے۔ قدر کی رات بہتر ہے ہزار مہینے سے۔ اترتے ہیں فرشتے اور روح پاک اس کے اندر اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کے واسطے سلامتی ہے۔ یہاں تک کہ طلوع ہو فجر)

اس سورہ سے دو باتیں واضح ہوجاتی ہیں جو فضیلت ماہِ رمضان پر دال ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کو خدائے پاک نے شب قدر میں نازل فرمایا اور دوسری بات یہ ہے کہ شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ سطورِ بالا میں یہ ذکر

ہوچکا ہے کہ رسولؐ نے فرمایا کہ شبِ قدر کو رمضان کے اخیر عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ اس رات میں ملائکہ اور ارواح کا نزول طلوعِ فجر تک ہوتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ خیر و برکت سے مالامال ہے اور خصوصاً اس ماہ کا عشرۂ اخیر جو پورے رمضان کا ماحصل ہے۔

روزہ کی چوتھی خصوصیت سحر و افطار کا التزام ہے۔ یہ دونوں شرب و طعام کے جاری رکھنے کے انتہائی حدود ہیں۔ سحر کا وقت صبح صادق کے نمودار ہوتے ہی ختم ہوجاتا ہے۔ اس کی اجازت خط ابیض کے ظاہر ہونے کے وقت سے پہلے ہے۔ اس کا اشارہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں ہے۔

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ط

(اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو واسطے تمہارے تاگا سفید کالے سے پھر پورا کرو روزے کو رات تک)

سحری کی فضیلت بہت زیادہ ہے۔ یہی وہ شئے ہے جس سے اسلامی اور غیر اسلامی روزوں میں تمیز پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے رسولؐ نے اس کے التزام پر کافی زور دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے "سحری کھاؤ اس لئے کہ سحری میں برکت ہے"

سحری کھانے میں جسمانی اصلاح کی مصلحت بھی پوشیدہ ہے۔ اس لئے کہ اس کے نہ کھانے پر بدن میں نقاہت پیدا ہوتی ہے اور نتیجتاً امراض کے پیدا ہونے کا خدشہ ہے اور افطار، اصلاح جسم و روح دونوں کا ضامن ہے۔ افطار کا وقت غروب آفتاب کے فوراً ہی بعد شروع ہوتا ہے۔ سحری میں تعجیل اور افطار میں تاخیر بہتر ہے۔ افطار کے وقت صائم کے چہرہ پر ایک خاص قسم کی نورانی شگفتگی ہوتی ہے جس سے غیر صائم محروم ہوتا ہے۔ دوسرے روزہ داروں کو سحری کھلانے اور افطار کرانے کا بیحد ثواب ہے۔ سعادت دارین حاصل کرنے کا اچھا موقع ہے۔ رحمت بات بات پر بہانہ ڈھونڈھ کر فیضان سے اس ماہِ مبارک میں روزہ داروں کو بہرہ ور کرتی ہے اس مبارک مہینہ کی آخری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآنِ پاک کی تلاوت کثرت سے کی جاتی ہے۔ روزہ دار نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ کلامِ الٰہی تلاوت کرتے ہیں۔ چونکہ کلام پاک اِس زمانہ میں نازل ہوا اس لئے خاص طور سے اس میں ختم کلام پاک کا التزام کیا جاتا ہے۔ تراویح اور شبینہ کا التزام اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ کلام پاک سننے اور سنانے دونوں کا ثواب ہے۔ اس لئے خود تلاوت کرنا چاہیئے اور تراویح میں کلامِ پاک سننا چاہیئے۔ آنحضرتؐ

جبریلؑ کو اس ماہِ مبارک میں کلام پاک سناتے تھے۔

یہ ہیں روزہ کے چند خصائص جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ مبارک مہینہ برکتوں سے مالا مال ہے۔ سعادتوں کے دروازے اس میں وا ہو جاتے ہیں۔ اور رحمتِ ایزدی کا فیضان بے حد و حساب ہوتا ہے خدا نے اِس کو اپنا مہینہ قرار دیا ہے۔ اور روزہ کا اجر خود کو بتایا ہے۔ ہر عملِ صالح کا اجر کچھ نہ کچھ مقرّر ہے جو اللہ اپنے صالح بندوں کو عطا کرے گا۔ لیکن روزہ دار کی اُجرت میں رب دو جہاں خود اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ ذرا بتائیے تو سہی کہ اس سے بہتر اور اعلیٰ کون سی اُجرت ہو سکتی ہے اور کتنا خوش نصیب ہے وہ انسان جسے یہ نعمت غیر مترقبہ حاصل ہو۔ انسانیت جس کے حصول کے لئے روزِ ازل سے پیچ و تاب کھاتی رہی۔ زندگی جس منبعِ کل سے وصل حاصل کرنے کے لئے قرنہا قرن سے غلطاں و پیچاں رہی۔ وہ نعمتِ عظمیٰ محض روزہ کی خاطر حاصل ہو تو بدنصیب ہے وہ شخص جو اپنے تغافل و تکاسل کی وجہ سے اس سے محروم رہے۔

ماہ رمضان کو عبادت و ریاضت کا مہینہ بنانا چاہیئے۔ اور اپنے معبودِ حقیقی کی خوشنودی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ عبادت عین فطرت عبدیّت کے مطابق ہے۔

اس لئے کہ انسان کو خدائے پاک نے عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے :-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ؕ

(اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں)

پس عبادت اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ بھی ماہ رمضان کی عبادت انسانوں کی خاک کو اکسیر بنانے والی ہے۔ یہ وہ شے ہے کہ جس سے ذرہ آفتاب اور پتھر پارس پتھر بن جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو لازم ہے کہ وہ ماہِ صیام میں جو خدا کا مہینہ ہے۔ عبادت و ریاضت کا حق ادا کرے اور اس طرح سعادتِ دارین حاصل کرے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر شے کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ صوری اور معنوی۔ روزہ کی بھی دو شکلیں ہیں۔ صوری اعتبار سے روزہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک خورد و نوش اور خواہشاتِ نفسانی سے پرہیز کرنے کا نام ہے اور معنوی حیثیت سے روزہ اپنے اندر صبر و تحمل و خدا ترسی کا جذبہ پیدا کرنے کا نام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنے کردار کو تقویٰ کے جوہر سے مزین کیا جائے۔ مقدم الذکر اتنا اہم نہیں ہے جتنا موخر الذکر۔ کیونکہ پہلا مقصود بالذات نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ؕ لیکن

التزام دونوں کا ضروری ہے ورنہ مقصد فوت ہوجائے گا۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی روزہ اپنے اندر خاص خوبیاں رکھتا ہے اور متعدد اعتبارات سے غیراسلامی روزوں سے ممیّز ہے۔ پس اسلام کے قبل الہامی یا غیرالہامی مذاہب جواب زمانہ کی چیرہ دستیوں سے مسخ ہوگئے ہیں اُن کے درمیان جو روزہ کا تصوّر ہے اس میں یا تو افراط ہے یا تفریط۔ اعتدال کا فقدان ہے۔ اس میں یا تو نفس پر بیجا تشدّد برتا گیا ہے یا نفس کو چھوٹ دے دی گئی ہے۔ تواذن کی کمی صاف صاف نمایاں ہے لیکن اسلام میں جو روزہ کا تصوّر ہے اس میں جسم و روح دونوں کے ارتقا کا سامان بہم پہنچایا گیا ہے۔ اور دونوں میں سے کسی پر بھی بیجا تشدّد نہیں برتا گیا ہے۔

جیساکہ میں نے عرض کیا ہے۔ روزہ جسمانی امراض سے بھی نجات دیتا ہے۔ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ معدہ کی خرابی سے بیشتر امراض پیدا ہوتے ہیں اور روزہ معدہ کی اصلاح کرکے جسمانی امراض و علل کے امکانات ہی کو ختم کردیتا ہے۔ اور ایک ماہ تک اس پر متواتر عمل کرنے سے معدہ کی قطعی اصلاح ہوجاتی ہے۔ جو بیماریوں کا گھر ہے اس ضمن میں ایک اثر بھی ملاحظہ ہو۔

"معدہ امراض کا گھر ہے اور فاقہ کشی سب سے بڑی دوا"

جسم کے ساتھ ساتھ روح کی اصلاح اور ترقی پر بھی اس کے اندر بھرپور رعایت موجود ہے۔ روحانی ارتقا اور تہذیبِ نفس کے لئے اس میں بڑی وسعت ہے۔ علاوہ بریں انسانی کردار کی اصلاح اس سے زیادہ بہتر ذریعہ سے ممکن نہیں ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل احادیث قابلِ توجہ ہیں۔

(۱) "جو روزہ رکھ کر جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اس کا کھانا پینا چھوڑنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

(۲) "جب کوئی روزہ سے ہو تو بری بات نہ بولے۔ شور و ہنگامہ نہ کرے اگر کوئی گالیاں دے یا جنگ کرے تو کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔"

(۳) "کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کا مردار گوشت کھائے جس کے کھانے کے تم روادار نہیں ہو۔ تو پھر یہ کیا ماجرا ہے کہ دن بھر چاول روٹی تو نہیں کھاتے، پانی نہیں پیتے مگر اپنے بھائیوں کا گوشت کھاتے میں اور خون پینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتے۔"

ازیں قبیل اور بھی احادیثِ پاک ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ روزہ انسان کے اخلاق اور کردار کو سنوارتا ہے۔ اور ایک صالح معاشرہ وجود میں لاتا ہے جو جسمانی اعتبار سے

صحت مند، اخلاقی اعتبار سے بلند اور روحانی اعتبار سے ارفع و اعلیٰ منازل پر فائز ہوتا ہے۔ پس اس سے یہ حقیقت بیّن طور سے واضح ہوگئی کہ اسلام میں جو روزہ متصوّر ہے وہ مندرجہ واضح خوبیوں کی بنا پر دیگر مذاہب کے روزوں سے ممیّز ہے۔ اس میں توازن ہے۔ اعتدال ہے اور جسم و روح کے امراض کا علاج ہے یہ فرد و جماعت کے ارتقا کا ضامن ہے۔ اور ایسا صالح معاشرہ پیدا کرتا ہے جو جسمانی اعتبار سے صحت مند اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے بلند مرتبہ کا حامل ہے

اسلام میں جمہوریت کا تصوّر

زمانہ کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ اِس نے تصورات کو اُلجھا کر ہمیشہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اور غلط نہج پر اپنے تصوّرات کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مفاد پرست اور اہلِ غرض حضرات نے پہلی فرصت میں ایسے مواقع سے متمتع ہونے کی حتی الامکان کوشش کی۔ بہت سے ایسے حضرات ہیں جن کا ذہن خود اُلجھا ہوا ہے یا جن کے تحت الشعور میں مخصوص عوامل کار فرما ہیں، ایسے تصوّرات کے نتائج سے بے خبر ہو کر اِسے توڑ مروڑ کر غلط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ذہنی مرعوبیت کا ثبوت ہے اور یہ ان کے تصوّرات کے کھوکھلاپن پر دال ہے۔

جمہوریت کے تصوّر کے ساتھ بھی یہی سانحۂ عظیم پیش آیا۔ مغرب کے مفکّرین نے اس کے ابتدائی نقوش کا دھندلا خاکہ ماضی کے دھندلکے میں ڈھونڈھنے کی کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ جمہوریت کا ابتدائی سرچشمہ ایتھنس کا

جمہوری نظام (ATHENIAN DEMOCRACY) ہے
جس میں حکومت بلدہ (CITY STATE) کا وجود ملتا ہے
افلاطون (PLATO) کے ریپبلک (REPUBLIC) میں بھی
فلسفۂ سیاست (POLITICAL THEORY) کی وضاحت
کے سلسلہ میں اس کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ہلاس (HELLAS)
کے متبعین نے جو HELLENISTIC CULTURE پیش
کیا ہے اُس میں بھی اِس نظریہ کے ابتدائی نقوش مرتسم ملتے
ہیں۔ اس نظامِ جمہوری میں رائے دہندگی کا طریقہ
بالرّاست (DIRECT) تھا جو آج کے وسعت پذیر اور طویل و
عریض مملکتوں کے لئے ناموزوں ہے۔ آج کا طریقۂ انتخاب سوائے
سوئٹزرلینڈ کے مخصوص حلقہ کے تمام عالم میں بلاواسطہ
(INDIRECT) طور پر ہوتا ہے۔ بہر صورت موجودہ جمہوری
نظام کا ڈانڈا یونان کے اس جمہوری تصوّر سے ملایا جاتا ہے۔
جو آج اپنی انتہائی عروج کی شکل میں تمام عالم پر محیط ہے

قبل اِس کے کہ ہم موجودہ جمہوری نظام پر گفتگو کریں
یہ بتادینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جمہوریت اصل ہے کیا شئے۔ جمہوریت
کا موجودہ رائج تصور یہ ہے کہ یہ ایک ایسا نظام سیاسی ہے
جس کو جمہور، جمہور سے جمہور کے لئے چلاتے ہیں۔ زبانِ فرنگ
میں اس کی تعریف درج ذیل ہے :-

"GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE-PEOPLE, FOR THE PEOPLE"

ایسے نظام کا تصوّر ذہن میں آتے ہی بہت سے سوالیہ نشانات انسانی ذہن میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ اور ان شکوک کے ازالہ کے بغیر قلب کو طمانیت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً

(۱) ایسا نظام انسان کی زندگی کے ایک پہلو سے متعلق ہوتا ہے۔ اس لئے انسانی زندگی کے دیگر پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں۔ زندگی کے ایک پہلو میں ایک تصوّر کارفرما ہوتا ہے اور دوسرے پہلوؤں میں دیگر تصوّرات۔ اِس تضاد سے زندگی میں افراط و تفریط کے وسوسات کی راہیں کُھل جاتی ہیں۔

(۲) یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ انسان ضعیف البنیان اور مجموعۂ اغلاط ہے۔ اس لئے اقتدار اعلیٰ اُس کے ہاتھ میں رہنے سے ان تمام نقائص اور معائب کے اُبھرنے کا امکان ہے جو اس کی سرشت میں موجود ہیں۔

(۳) چونکہ صلاحیتیں برابر نہیں ہوتیں اس وجہ سے ہمیشہ وہ ذہن غالب ہوجاتا ہے جو اوروں کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور مکمل ہوتا ہے۔ اس طرح ایک خطرناک قسم کی آمریت اُبھر آتی ہے جو کلیّت TOTALITARIANISM کے تمام فیوض و برکات سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ اور جمہوریت کے

نام پر آمریت کا جواز پیدا کرتی ہے۔ یہ نہایت ہی خطرناک قسم کی جمہوریت ہوتی ہے۔

یہ اور ازیں قبیل دیگر مسائل اس ضمن میں منظر عام پر آتے ہیں۔ جن کا تشفی بخش حل موجودہ مغربی جمہوریت کے پرستاروں کو پیش کرنا ہے۔

موجودہ جمہوری نظام انقلابِ فرانس کے بطن سے پیدا ہوا۔ یہ انقلاب ۱۷۸۹ء میں برپا ہوا اور تاریخ میں FRENCH REVOLUTION کے نام سے مشہور ہوا اس کے بہت ہی زیادہ دور رس اثرات مترتب ہوئے۔ اس نے زمین و آسمان بدل دی۔ طریقۂ فکر بدل ڈالا۔ طرز زندگی میں عظیم تغیرات ظہور پذیر ہوئے۔ قرنہا قرن کی منجمد زندگی میں تحریک پیدا ہوگئی۔ سیاست، ادب، کلچر، تمدن، معاشرت اور ثقافت میں بہت ہی گہرے نقوش مترتب ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے اِس کی رویں فرانس کی چہار دیواری سے نکل کر تمام عالم شرق و غرب پر محیط ہوگئیں۔

سلطنت برطانیہ میں سب سے پہلے 'شاندار انقلاب' GLORIOUS REVOLUTION ۱۶۸۸ء میں ہوا اس کے بعد صحیح معنوں میں پارلیمانی نظام حکومت قائم ہوئی۔ گرچہ اس کے ابتدائی نقوش ۱۶۴۹ء میں چارلس کے پھانسی دینے کے

بعد سے نمایاں ہیں۔ اس نظامِ حیات نے پارلیمانی خودمختاری کا تصوّر عطا کیا۔ شاہ کی حیثیت محض آئینی سربراہ کی رہی۔ قوت و اقتدار کا سرچشمہ شاہ کے بجائے عوام بنے۔ گرچہ دستوری اعتبار سے شاہ کی حیثیت حرفِ آخر کی تھی۔ یہ تضاد صاف صاف نفاق کی غمازی کرتا ہے۔ شہنشاہیت اور جمہوریت کا ایک عجیب امتزاج پیدا ہوگیا جو تاامروز قائم ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ میں جمہوری شعور ۱۷۷۵ء میں امریکہ میں جنگِ آزادی AMERICAN WAR OF INDEPENDENCE کے بعد پیدا ہوا۔ صدر کو آئینی سربراہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔ عوام اقتدار کے مخرج بنے۔ اور ان کے منتخب نمائندے سیاہ و سفید کے مالک ہوئے۔ امریکہ کا صدر شاہِ برطانیہ سے زیادہ صاحب اقتدار قرار پایا۔ اس لیے کہ بہرصورت وہ عوام کا نمائندہ تھا۔

۱۷۸۹ء کے سیاسی تغیرات کے بعد فرانس نے ایک نئے تصوّر کو جنم دیا۔ کچھ دنوں تک تو یہاں کے نظامِ حیات میں شہنشاہیت کی بو باقی رہی لیکن نپولین سوم کی وفات کے بعد عوامی حکومت شروع ہوئی۔ یہ فرانس کی تاریخ میں نہایت ہی اہم باب کا اضافہ ہے جس نے فرانس کے علاوہ اکنافِ عالم کو متاثر کیا۔ اس کے بعد یہاں کے سیاسی نظام نے بہت سے

نشیب و فراز دیکھے لیکن اس میں جمہوریت کا عنصر غالب رہا۔

ازیں قبیل سرزمینِ روس جو قرنہا قرن سے زارِ شاہی کے جور و استبداد کی زد میں تھی اس نے بھی ۱۹۱۷ء میں شہنشاہیت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا۔ اور یہاں بھی عوامی حکومت کا دور شروع ہوا۔ لیکن یہاں بھی ایک مخصوص جماعت برسرِ اقتدار آگئی اور یہی وجہ ہے کہ آج بالشویک جماعت BOLSHOVIK کی حکومت قائم ہے۔ یہاں کی حکومت مارکس کے اصولِ سیاست پر عامل ہے اور اس کو سیاسی مسائل کا حتمی حل تصور کرتی ہے۔ اس ضمن میں اختلافات بھی رونما ہوئے۔ لینن، ٹراٹسکی اور اسٹالن نے فلسفۂ اشتراکیت کی تعبیر و تشریح میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا جس نے اس نظریہ کو شدید دھچکا لگایا۔ اور آج وہاں کی عملی سیاست کے ساتھ ساتھ نظریاتی تصورات میں بھی تزلزل پیدا ہو گیا ہے۔ خروشیف اور بلگانن نے تھرڈ انٹرنیشنل THIRD INTERNATIONAL کے خاتمہ کا اعلان کر کے اس کی بین الاقوامی حیثیت کو شدید ضرب لگایا ہے۔ انفرادی ملکیت PRIVATE PROPERTY نے ایک حد تک اس معاشرہ میں راہ پالی ہے۔ قومی حکومت کا رنگ پیدا ہوتا جا رہا ہے اور قومیت کے تمام جراثیم رفتہ رفتہ سرایت کر رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جگہ جگہ سے

جائے اشتراکیت سرک رہی ہے۔ تخریب کے آثار نمودار ہو چلے ہیں۔ حقائق کی تکذیب کا جو حشر ہوتا ہے وہ یہاں صاف صاف نظر آرہا ہے اور اقبالؒ کا یہ قول صادق آرہا ہے

ع جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔

مغربی جمہوریت کا سب سے کامیاب تجربہ سوئٹزرلینڈ میں ہوا اور وہاں بہت حد تک یہ تجربہ کامیاب بھی رہا۔ آج جمہوری نظام جس تکمیلی شکل میں وہاں موجود ہے وہ دنیا کے کسی دوسرے مقام پر نہیں ہے۔ اسی لئے ایک جمہوری عکاسیت کی مثال پیش کرتے وقت اس کا نام فخریہ انداز میں لیا جاتا ہے۔ یہاں کبھی بھی بحران پیدا نہیں ہوا۔ حکومت نہایت پائیدار اور استوار رہی۔ یہاں بالراست طریقۂ انتخاب بھی رائج ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مغربی مفکّرین کے مطابق جمہوریت کا تصور بہت قدیم ہے۔ یہ چشمہ سرزمینِ یونان سے پھوٹا اور انقلابِ فرانس نے اس کی آبیاری کردی۔ پھر تمام عالم کے ذہن پر یہ تصور محیط ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ تمام ممالک کے سیاسی نظام نے چولا بدلا اور سماج نے ایک نئی شکل اختیار کرلی۔ ادب، ثقافت اور دیگر شعبہ ہائے حیات بھی اس سے متاثر ہوئے۔

اگر پیش کردہ اجمالی خاکہ پر ہم غور کریں گے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ مختلف ممالک میں

جو جمہوریت کے تجربات ہوئے اُس نے ان بنیادی سوالات کا حقیقی حل پیش نہیں کیا ہے جو میں اوپر درج کر چکا ہوں۔ تمام خامیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جس سے جمہوریت کا ارتقا نہایت غیر صالح ہوا۔ جس نے فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچایا۔ اس لئے کہ اب سب کچھ جمہوریت کے نام پر کیا جانے لگا اور عوام کے لب پر مہرِ سکوت لگادی گئی۔ یہ ارتقا نہایت خام رہا اور شہنشاہیت نے چولا بدل کر بار بار اس تصور پر حملہ کیا۔ کہیں تو اس نے پارلیمانی نظام کے نام پر حکومت کی۔ کہیں پر اختیارِ خصوصی حاصل کرکے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ کبھی ایک مخصوص جماعت کی شکل میں آمریت کا فرض انجام دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جمہور غلام کے غلام رہے۔ اور جمہوریت کے نام پر وہ سب کچھ روا رکھا گیا جس کی مثال شہنشاہیت میں بھی عنقا ہے۔ آج بھی انسان، انسان میں تفریق ہنوز باقی ہے بلکہ زیادہ گھناؤنی شکل میں موجود ہے۔ کالے اور گورے کی تمیز اپنی تمام شدتوں کے ساتھ موجود ہے۔ خواص، عوام پر حکمراں ہیں۔ قوانین صرف خستہ حالوں کے لئے مخصوص ہیں اور خواص مستثنیات سے متمتع ہوتے ہیں۔ دن دھاڑے یہ دھاندلی مچی ہوئی ہے۔

مغربی جمہوریت کے مفاسد کا اختصاراً جائزہ لیا گیا ہے۔

اب ذرا اسلامی جمہوریت کے تصوّر پر بھی غور کیجئے تو حقائق نکھر کر سامنے آجائیں گے۔ اسلام نے جمہوریت کے تصور کو محض سیاسیات تک محدود نہیں رکھا ہے۔ اس نے اِس کو پوری معاشرتی زندگی پر پھیلا دیا ہے۔ اور ترقی کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھول دیا ہے۔ اس نے اِس کی بنیاد مساوات پر رکھی ہے۔ اور اس کے نہایت ہی صالح اور صحیح تصوّر سے زمانہ کو روشناس کیا ہے۔ عبادت گاہوں کے دروازے پر شیخ کا پہرہ نہیں بٹھایا بلکہ ہر کس وناکس کے لئے اس کے دروازے کھول دئیے۔ اقتدارِ اعلیٰ کا مخرج خالقِ مطلق کو قرار دیا۔ انسان کو زمین پر خدا کا نائب بتایا۔ اور اِس طرح تمام مخلوقات پر اِسے شرف حاصل ہوگیا۔ خلیفۃ اللہ کا کام خدا کے فرستادہ نظامِ حیات کی روشنی میں نظامِ عالم کو چلانا قرار دیا۔ قربِ خداوندی کو معیارِ شرف قرار دیا گیا اور خدا کی حکومت کا اعلان کیا گیا۔ انسان کو انسان کی عبدیت سے نجات ملی۔ اس نے معروف و منکر سے آشنا کیا۔ انسانی زندگی کے طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی مسائل کے حل کے لئے ایک ایسا نظامِ حیات پیش کیا جو انسان کی فطرتِ صالح کی صحیح نباضی پر دال ہے۔

قدرتِ کاملہ نے اِس ضابطۂ حیات میں دو قسم کے مسائل پیش کئے۔ محکمات اور متشابہات۔ محکمات پر عمل

کرنے کی تلقین کی اور متشابہات میں ذہنی کاوش سے ابا کا
حکم دیا۔ گرچہ غور و فکر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا۔ اگر یہ
خلوصِ نیّت، صداقت اور خشیت الٰہی کے پیش نظر ہو۔
اِسی لیے یَتَفَکَّرُوْنَ، یَتَدَبَّرُوْنَ، یَعْقِلُوْنَ، سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ
وغیرہ سے اس جذبۂ صادقہ کو بار بار اُبھارنے کی کوشش کی گئی۔
محکمات کی روشنی میں جزئیات میں غور و فکر کرنے کی تلقین کی
لیکن محکمات میں کسی بھی ترمیم و تنسیخ یا جزئیات میں محکمات
سے انحراف کا حق قدرت نے کسی کو بھی نہیں بخشا۔ انسان کا
صرف یہ کام ہے کہ قدرت کے مرتّب کئے ہوئے نظامِ حیات کو
سرزمینِ عالم پر اس کے امین کی حیثیت سے چلائے۔ اس سے
انحراف اُسے خائن بنا کر چھوڑے گی۔ اپنی مخلصانہ کاوشوں سے
ایسا معاشرہ پیدا کرے جس میں خدا کے پرستار اپنی فطری صلاحیتوں
کو حتی الامکان صحیح خطوط پر آگے بڑھا سکیں۔ اور جس میں
انسان کی حکمرانی اور بندگی کے بجائے خدا کی حاکمیّت ہو اور
انسان نائب محض ہو۔

اس نظامِ حیات کے چلانے والے دوسرے حکمرانوں کی
طرح جابر اور ظالم نہیں ہوتے۔ بلکہ مخلص، خداترس اور
حقوق اللہ اور حقوق العباد کے محافظ و امین ہوتے ہیں۔ اِس
نظامِ حیات میں سب کو مساویانہ حقوق حاصل ہوتے

ہیں۔ ایک شخص دوسرے کو غلط راہ کی طرف رجحان دیکھتے ہی برجستہ ٹوک دیتا ہے۔ تمام متقیانہ جاہ و جلال کے باوجود حضرت عمرؓ کو ایک معمولی شخص غلط فہمی کی بنا پر اپنے خیال میں اجتہادی سہو کی طرف رُجحان دیکھ کر برسرِ منبر ٹوک دیتا ہے اور آپؓ بجائے رنج فرمانے کے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جب تک ایسے حق پرست اور حق پسند حضرات اسلامی معاشرہ میں موجود ہیں۔ عمرؓ سے غلطی نہیں ہوسکتی اور وہ بھٹک نہیں سکتے۔ یہ ہے جمہوریت کی اصل روح جس کو اسلامی نظامِ حیات نے پیش کیا۔

برخلاف اِس کے فی زمانہ جمہوریت صرف انتخاب تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔ رنگ و نسل، ذات پات، چھوٹے بڑے کی تمیز قدم قدم پر سنگِ گراں بن کر سدِ راہ ہے۔ عوام کی کس مپرسی ہے اور خواص کی دھاندلی ہے۔ علاوہ بریں مغربی جمہوری نظامِ حیات میں فیصلہ حق و باطل کے معیار پر نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف عددی موافقت پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حق وہ ہو جس کی ترجمانی دس آدمی کر رہے ہوں لیکن چونکہ گیارہ آدمی کسی بھی وجہ سے اِس کی مخالفت کرتے ہیں اس لئے اِسے باطل قرار دیا جاتا ہے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ آنجہانی ڈاکٹر امرناتھ جھا نے ال۔ ایس۔ کالج کے

سائنس اور آرٹس کی اکاڈمی کو مخاطب کرتے ہوئے مغربی جمہوریت کے اِس نقص کی وضاحت اقبالؒ کے مندرجہ ذیل شعر سے کیا تھا:۔ ؎

جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے
اقبال

لیکن اسلامی جمہوریت اِس نقص سے پاک ہے وہاں فیصلہ کا معیار حق و باطل پر ہے جس کی نشان دہی قدرتِ کاملہ نے اپنے صحیفۂ پاک میں کر دیا ہے۔ اِس میں تغیّر و تبدل کا قطعی اختیار کسی کو نہیں ہے۔ اس میں انسانی قوانینِ الٰہیہ کا صرف امین و محافظ ہوتا ہے۔ اور اُسی کی روشنی میں جزئی مسائل کا فیصلہ کرتا ہے۔ امیر کے انتخاب میں صرف جمہور کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس کا معیار، علم و فضل اور حسنِ عمل پر ہے۔ قرابت، رنگ و نسل کا یہاں قطعی پاس نہیں ہے۔ حق کی حمایت اور باطل کا بطلان ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مغربی جمہوریت اپنے اندر نہایت خطرناک مفاسد کی پرورش کرتی ہے۔ اور جمہوریت کے نام ایک مخصوص طبقہ کی خدائی دوسروں پر مسلط کر دیتی ہے۔ اور ہر منکر کو معروف کی شکل میں پیش کر کے ذاتی

مفاد کے پیش نظر اس سے متمتع ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ اب ان تمام مفاسد سے دنیا آشنا ہو چکی ہے اور اب زمانہ جمہوریت کی فطرت صالحہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ ابھی بھی مغرب زدہ حضرات طرح طرح سے مغربی جمہوریت کی حمایت میں رطب اللسان ہیں اور اس طرح اپنی کور باطنی اور کج فہمی کی وجہ سے جمہوریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے پر آمادہ ہیں۔ اُن کی یہ کورانہ حمایت، بصیرت افروز ذہن کے لیے تازیانہ ثابت ہوگی اور حسّاس دل جمہوریت کے اُن معائب سے بھی آشنا ہو جائیگا جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں۔ بہت سے اسلامی مفکّرین، مغربی جمہوریت کا ڈانڈا اسلام سے ملانے کی سعیٔ نا مشکور کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر کے اطمینانِ قلبی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کہ مغربی جمہوریت میں اسلامی جمہوریت کی روح کارفرما ہے جو حقیقت کا صریح بطلان ہے۔ یہ ان حضرات کی ذہنی احساسِ کمتری پر دال ہے۔ آج حق کا معیار ایسے حضرات کے لئے اسلام اور اس کے مسلّمات نہیں ہیں بلکہ وہی حق ہے جو مغربی ذہن کے تراشیدہ اور مضرت رساں تصورات پر پورے اتریں جن کی حقیقت شہد آلود زہریلے گھونٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ زندگی کے شعبہ میں اسلام کے لباس کو مغربی تصورات
کے قد پر موزوں کرنے کی عبث سعی کی جاتی رہی ہے۔
یہ جذبہ، اعترافِ شکست ہے اور ذہنی احساسِ کمتری کی
غمازی کرتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ مغرب کے
پُرفریب جمہوریت کے تصوّر سے اسلامی جمہوریت کے تصوّر کو
دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام میں جمہوریت کا تصوّر
ایک ایسے مقدس جذبہ کی طرف اِشارہ کرتا ہے جو دنیاوی
فوز و فلاح کا ضامن اور دینوی نجات کا مبشر ہے، یہ اللہ
کی حاکمیت اور اللہ کی بندگی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یہ
مساوات بخشتا ہے۔ انسانی ذہن کے تراشیدہ تمام
فتنہ پردازیوں اور رذالتوں سے انسانیت کو بلند کرکے
ایسی سطح پر لاتا ہے جہاں سب کے حقوق مساوی ہیں
اور تقدّم و تفضّل محض قربِ خداوندی پر منحصر ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر ہمارے مفکرین کو اپنے
تصوّرات پر نظرثانی کرنی چاہیئے۔ اور مغربی جمہوریت کے
پیدا کردہ دوررس مضر نتائج پر ٹھنڈے دل و دماغ سے
غور کرنا چاہیئے۔ اور تعصب کی نیچی سطح سے بلند ہو کر اسلامی
جمہوریت کے فیوض و برکات سے استفادہ کی کوشش

کرنی چاہئے اور ایک ایسے معاشرہ کے تصوّر کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کرنی چاہئے جہاں انسان اشرف المخلوقات ہو۔ انسان، انسان کا نہیں صرف خدا کا بندہ ہو اور اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں اخلاص ہو، نفاق نہ ہو۔ فرد اور جماعت کو صالح خطوط پر آگے بڑھنے اور اپنے ارتقائی منازل طے کرنے کے تمام مواقع یکساں طور پر سب کو حاصل ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ط

اسلام کا فلسفۂ اجتماعیت

انسانی تمدن کے آغاز سے لے کر آج تک اجتماعیت کے مختلف فلسفے پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ کیونکہ فرد و جماعت کے تعلق کو متعین کرنے میں جو خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے انسانیت نے بار بار ٹھوکریں کھائی ہیں ظاہر ہے کہ انسان کی انفرادی زندگی اپنی بقا و تحفظ کے لئے اجتماعیّت کی متقاضی تھی ہبوطِ ارضی کے بعد جب حضرت آدمؑ کی نسل بڑھی تو فرد نے کنبہ کی شکل اختیار کرلی۔ کنبہ نے پھیل کر مختلف گروہوں کی شکل میں اکنافِ عالم کو آباد کیا۔ عرصۂ دراز تک انسانی قافلہ گلہ بانوں کی سی زندگی بسر کرتا رہا۔ مدتِ مدید کی خانہ بدوشی کی زندگی کے بعد مستقل اقامت کی ضرورت محسوس کی گئی اور یہ قافلے دور دراز کے ایسے علاقوں میں آباد ہوگئے جہاں زندگی گزارنے کے لئے صرف ابتدائی وسائل میسر تھے۔

یہ اجتماعیت کی ابتدائی منزل تھی۔

انسان اس قسم کی زندگی پر مطمئن نہیں رہ سکتا تھا اس کی فطرت میں "خوب سے خوب تر" کی تلاش کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس نے فطرت کی بے پناہ طاقتوں کو مسخّر کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے کہ قدرتِ کاملہ نے روزِ ازل ہی میں "ضمیر کن فکاں" اور "تسخیرِ فطرت" کا جذبۂ بے کراں اس کے نہاں خانۂ دل میں مستور کر دیا تھا۔ کلامِ پاک میں اسی کی طرف مندرجۂ ذیل آیت میں اشارہ ہے۔

سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ الخ

اس نے زمین پر قبضہ کیا، وحوش وطیور کو مسخّر کیا فضائے آسمانی کی تسخیر کی۔ اتھاہ سمندر کے عمق اور اس کی طوفان خیز موجوں کو مسخّر کر لیا خلاصہ یہ ہے کہ زمین وآسمان پر اس کی حکمرانی مسلم ہوگئی۔ اب وہ ناپیدا کنار سمندروں کے سینوں کو چیر کر نکل جاتا۔ فضا کی پہنائیاں اس کی بے پناہ قوتِ تسخیر کے سامنے سرنگوں تھیں۔ اس طرح انسان ترقی کے منازل نہایت سرعت کے ساتھ طے کرتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ اسے ایک تمدن کی ضرورت محسوس ہوئی اور تدریجاً انسانی زندگی میں مدنیت کا تصوّر اُبھرنے لگا اور معاشرہ وجود میں آنے لگا۔

جیسے ہی انسان انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف متوجہ ہوا اُسے اس کاروانِ حیات میں ضبط و نظم کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے تحفظ و بقا کے لیے ایک سرگروہ کا ہونا لازمی قرار پایا۔ یہی سرگروہ مختلف ادوار میں اور مختلف نظام ہائے حیات میں مختلف ناموں سے موسوم ہوا۔ بادشاہ، آمر، صدر، امیر اور خلیفہ وغیرہ اسی کے مختلف نام ہیں۔

افراد کے اس غیر منظم گروہ نے فلاح انسانی کے پیش نظر مختلف نظام ہائے حیات کے خاکے پیش کیے اور اجتماعیت کے ان گوناگوں تصوّرات نے انسانی ذہن میں ضبط و نظم کا شعور پیدا کیا اور رفتہ رفتہ ایک منظم اجتماعیت اُبھرنے لگی۔ انسانی زندگی میں ایک حسین توازن پیدا ہونے لگا۔ مدنیت سنورنے لگی۔ اس طرح افراد کی پنہاں صلاحیتوں کے انعکاس کے بہتر سے بہتر مواقع فراہم ہونے لگے۔

یہ سب باتیں ہوئیں لیکن انسانی ذہن توازن پر قائم نہ رہ سکا۔ مفکّرین دو گروہوں میں منقسم ہوگئے۔ ایک وہ جس نے انفرادیت پر زیادہ زور دیا اور دوسرا وہ جس نے اجتماعیّت کی حمایت کی۔ خلاصہ یہ کہ کبھی تو فرد نے

غالب آکر آمر کی ہیبت ناک شکل اختیار کرلی۔ اور کبھی جماعت، اشراکیت کے نام پر آمرانہ شان سے مسلط ہوگئی یہ دونوں راہیں غیر متوازن اور غیر معتدل تھیں۔ یہ افراط و تفریط انسانیت کے لئے سمِ قاتل ثابت ہوئی اور اس نے انسانی زندگی کو تہہ و بالا کردیا۔ فلسفۂ اجتماعیت کے مفکّرین کے لئے یہ نہایت ہی مشکل مقام تھا۔ اس گتھی کے سلجھانے میں اِن حضرات نے خوب خوب ٹھوکریں کھائیں لیکن ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شہنشاہیت، جمہوریت، آمریت، پارلیامانی جمہوریت اور اشتراکیت وغیرہ اسی قسم کے بحرانی ذہن کے پیدا کردہ نتائج ہیں۔ جو دوسرے امراض کے لئے دوا ہونے کے باوجود بذاتِ خود انسانیت کے لئے دردِ سر ہیں اور ان سے گلو خلاصی کئے بغیر انسانیت کی صحت مندانہ زندگی کا امکان نظر نہیں آتا۔

تہذیبِ نوی کے دور میں جو مفکّرین پیدا ہوئے اُن میں نیٹشے نے "فوق البشر" کا تصوّر پیش کیا اور اس طرح فرد کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا۔ اس کے فلسفہ کے تحت حکومت کرنے کا حق صرف ایسے فرد کو پہنچتا ہے جو سب پر فائق ہو، گرچہ

یہ فوقیت اُسے جائز یا ناجائز جس طرح سے بھی حاصل ہوئی ہو۔ ہٹلر اور مسولینی اسی ذہن کی پیداوار ہیں۔ اور یہ حضرات اپنے جور و ظلم کا جواز اسی فلسفہ میں تلاش کرتے ہیں اس فلسفۂ حیات میں ہم انتہا پسندی کے جراثیم پاتے ہیں۔ یہ انفرادیت کی بیجا حمایت ہے۔

مغربی مفکّرین میں مارکس نے اجتماعیت پر زیادہ زور دیا اور اس کی حمایت میں اس قدر غلو کیا کہ اجتماعیت کو مقصود بالذّات قرار دے دیا۔ اشتراکیت اسی خواب اور فلسفۂ حیات کی عملی تفسیر ہے۔ اس میں فرد محض اشتراکیت کی مشین کا پرزہ بن کر رہ گیا۔ اور زندگی کے مسائل اپنی جگہ پر باقی رہ گئے۔

اِن دونوں انتہا پسند زاویہ ہائے نظر کے درمیان بہت سے نظامہائے حیات معرضِ وجود میں آئے جن میں انہیں دو غیر معتدل اور غیر متوازن زاویہ ہائے نظر کے درمیان نقطۂ مفاہمت تلاش کرنے کی بے سود کوشش کی گئی۔ جمہوریت، پارلیامانی جمہوریت، سوشلزم، اشتراکیت وغیرہ کے تصوّرات اُبھرے لیکن ان سب کے وجود ہی میں خرابی مضمر تھی۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہو۔ دنیا انہی دونوں نقطہ نظر کے گرد سمٹ کر رہ گئی۔ اور ان دونوں گروہوں میں

بیجا تفوق اور برتری کے لئے نبرد آزمائی شروع ہو گئی۔ سرد جنگ نے کہیں کہیں حقیقی جنگ کی شکل اختیار کرلی۔ کوریا، مصر، چین، انڈوچین، تبت، کشمیر، فلسطین اور ایران میں جو کش مکش کی کیفیت نمودار ہے اور جہاں جنگ کے شرارے نمودار ہو رہے ہیں یہ سب اسی جوالا مکھی پہاڑ کے ادنیٰ شرارے ہیں جو انسانی ذہن میں پھٹنے کے لئے تیار ہے اور انسانیت نہایت ہی کش مکش اور تذبذب کے عالم میں انقلاب عظیم کے دوراہے پر مبہوت کھڑی ہے۔ اس انقلاب میں خیر و شر دونوں کا پہلو مضمر ہے۔ انسانی زندگی کی مکمل تباہی بھی ہو سکتی ہے اور ایک صحتمند معاشرہ بھی اُبھر سکتا ہے۔ مشیت ایزدی کی کلائی اگر انقلاب کا رُخ خیر کی طرف موڑ دے تو انسانیت تباہی سے بچ سکتی ہے۔ ورنہ بظاہر باطل نظامہائے حیات کی کش مکش سے تو تباہی مقدر معلوم ہوتی ہے۔

تاریخ انسانی میں ہمیں ان دو انتہا پسند نقطۂ نظر کے علاوہ ایک اور نقطۂ نظر ملتا ہے جس نے انسانی زندگی کی فلاح اور بہبودی کے لئے ایک فلسفۂ اجتماعیت کا تصور پیش کیا ہے جس میں فرد اور جماعت دونوں کے مقامات متعین کر دئے گئے ہیں جس میں اعتدال ہے۔

توازن ہے۔ اور فرد و جماعت کی زندگی میں ایک حسین ہم آہنگی ہے۔ جس میں فرد کی صلاح و فلاح مقصود بالذات ہے اور دیگر لوازم محض ضمنی حیثیت کے حامل ہیں جس میں فرد کو آمر بننے کی اجازت نہیں ہے اور نہ جماعت کو حاکمِ کل بننے کا اختیار ہے۔ جس میں فرد "فوق البشر" نہیں ہے بلکہ "خیر البشر" ہے اور جس میں جماعت فرد کی خفتہ اور پوشیدہ صلاحیتوں اور امکانات کے اظہار اور انعکاس کا ذریعہ ہے اور یہ معتدل اور متوازن نظامِ حیات اسلام کا فلسفۂ اجتماعیت ہے۔

اسلام میں اخوت اور مساوات کی تعلیم نے نیچ اونچ، کالے دگورے، پست قامت و بالا قامت، عربی و عجمی وغیرہ مصنوعی امتیازات کالعدم قرار دے دیئے گئے ہیں اس نے محض انسانی قدروں کی بنیاد پر ایک ایسے معاشرہ کو معرضِ وجود میں لانے کی ترغیب دی ہے جس سے انسانیت کا مقصد اولیٰ پورا ہوتا ہے۔ اس نے انسانی تصوّرات میں انقلابِ عظیم بپا کر دیا۔ بزرگی و برتری کا معیار محض "تقویٰ" پر رکھا۔ مصنوعی رکھ رکھاؤ اور خاندانی امتیازات کو غیر اہم قرار دیا۔ اس لئے شرف و تقدم کا یہ فطری معیار ہر صحت مند ذہن کے لئے قابلِ قبول ہوا۔ اور تمام فسادات کی جڑ کٹ گئی اور اس معیار پر جو معاشرہ

تاریخ انسانی میں معرضِ وجود میں آیا وہ آج تک دنیا
کے لئے ایک نادر مثال اور ایک بہترین نمونہ ہے۔ جس سے
استفادہ کی کوشش بہتوں نے کی لیکن تعصب کی وجہ
سے اس ماخذ کا ممنون ہونے کے بجائے اس کا نام تک
لینا گناہ تصوّر کیا جاتا ہے۔

آج کے پُرآشوب دور میں جبکہ دنیا تباہی کے غار
کے کنارے کھڑی لڑکھڑا رہی ہے، اسلام کا فلسفۂ اجتماعیت
ہی وہ دوا ہے جو تمام مفاسد کے لیے تریاق کا حکم رکھتی
ہے جس سے فرد اور جماعت کا صحیح مقام متعین ہوتا ہے
جس سے آمریت اور اشتراکیت کے مہلک جراثیم ختم ہوسکتے
ہیں اور جس سے فرد و جماعت کی زندگی میں ایک حسین
توازن اور ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے اور انسان امن و امان
کا پیکر بن سکتا ہے۔ اپنے لئے اور جماعت کے لئے انسان
بجائے زحمت کے رحمت ثابت ہوسکتا ہے اور اس طرح
خلّاقِ عالم کا مقصد پورا ہو جاتا ہے جس کے لئے اس نے
اپنے اس شاہکار 'انسان' کو پیدا کر کے اس کائنات میں اپنا
خلیفہ مقرر کیا اور کائنات کو اس کے لیئے مسخّر کر دیا۔ آئیے دعا
کریں کہ خدائے پاک انسان کو انسان بننے اور حق کو پہچاننے
کی توفیق عطا کرے۔ آمین ثم آمین۔

ہماری چند اہم مطبوعات

گلدستۂ میلاد ۱۴/عہ — شکوہ جواب شکوہ مع شرح - ۱۲/

سروش ہستی (مجموعۂ قطعات شاد عظیم آبادی) ۸/ہے — شرح القرأۃ الرشیدہ حصۂ اوّل - ۱۲/

شرح القرأۃ الرشیدہ حصۂ دوئم مع متن —— ۸/

پٹنہ کی اہم مطبوعات

تنقیدی مطالعے ۱۴/عے — پرکھ عکا/

مرزا محمد علی فدوی (دو جلدوں میں) ۴/عکہ - بہار کے نو چراغ ۱۲/عہ

بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا ۸/عہ - یارانِ میکدہ (نظموں کا مجموعہ) عکا

مثنویات راسخ —— معہ/

ہماری زیر طبع کتابیں

عملی تنقید — کلیم الدین احمد

میخانۂ الہام — شاد عظیم آبادی

بہار کے صوفیہ — ضیا جالوی

کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴

مظفر پور میں ہماری مطبوعات ملنے کا پتہ :- کریم بخش تاجر کتب کمپنی باغ مظفر پور